یہ کتابچہ دراصل مسلم اقلیت آبادیوں کے مسائل
سے تقریباً دو دہائی کے فکری، نظریاتی اور عملی رشتوں
کی تاثراتی بنیاد ہے۔ یہ کتابچہ دراصل ہندوستان
کی تمام پسماندہ آبادیوں کو ان کی سیاسی اور فکری
غلامی سے آزاد کرانے والی عوامی جدوجہد کی ایک
کڑی ہے۔
میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ میں مسلم سماج کی ان
پسماندہ آبادیوں کی مشکلات اور کشمکش کی بنیاد پر اقتدار
وقت یا کسی اور قوت سے کوئی سمجھوتہ کروں۔ میں تو
محض ان پسماندہ مسلم آبادیوں کو دعوت جدوجہد
دینے کی خاطر یہ مضامین لکھ سکا ہوں۔
جابر حسین

کی اکثریت بسی ہے ۔ تعلیم ، خواندگی اور حرف شناسائی محض نام لینے کو زندہ رہی ۔
میں نے ان مضامین کے ذریعہ بہار کی پسماندہ مسلم آبادیوں کے دلوں میں حرف شناسائی اور تعلیم کی ایک لو جگانے کی کوشش کی ہے ۔ یہی لو دراصل مستقبل میں ان کے روزگار ، باعزت زندگی اور پروقار شخصیت کی ضامن بنے گی ۔
میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ میں مسلم سماج کی ان پسماندہ آبادیوں کی مشکلات اور کشمکش کی بنیاد پر اقتدار و دقت یا کسی اور قوت سے کوئی سمجھوتہ کروں ۔ میں تو محض ان پسماندہ مسلم آبادیوں کو دعوتِ جد و جہد دینے کی خاطر یہ مضامین لکھ سکا ہوں ۔
یہ مضامین پٹنہ کے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ " قومی تنظیم " اور ہندی روزنامہ " نو بھارت ٹائمز " میں قسط وار شائع ہوتے رہے ہیں ۔ ان مضامین کو پڑھ کر متعدد صاحب فکر و عمل حضرات نے مجھے اپنے تاثرات بھیجے ہیں ۔ میں ان ہزاروں قارئین کے تئیں اظہار تشکر کرتا ہوں ، جنھوں نے ان مضامین میں فکر و عمل کے عناصر محسوس کیے ۔

بہار کی
پسماندہ مُسلم آبادیاں
جابِر حُسین
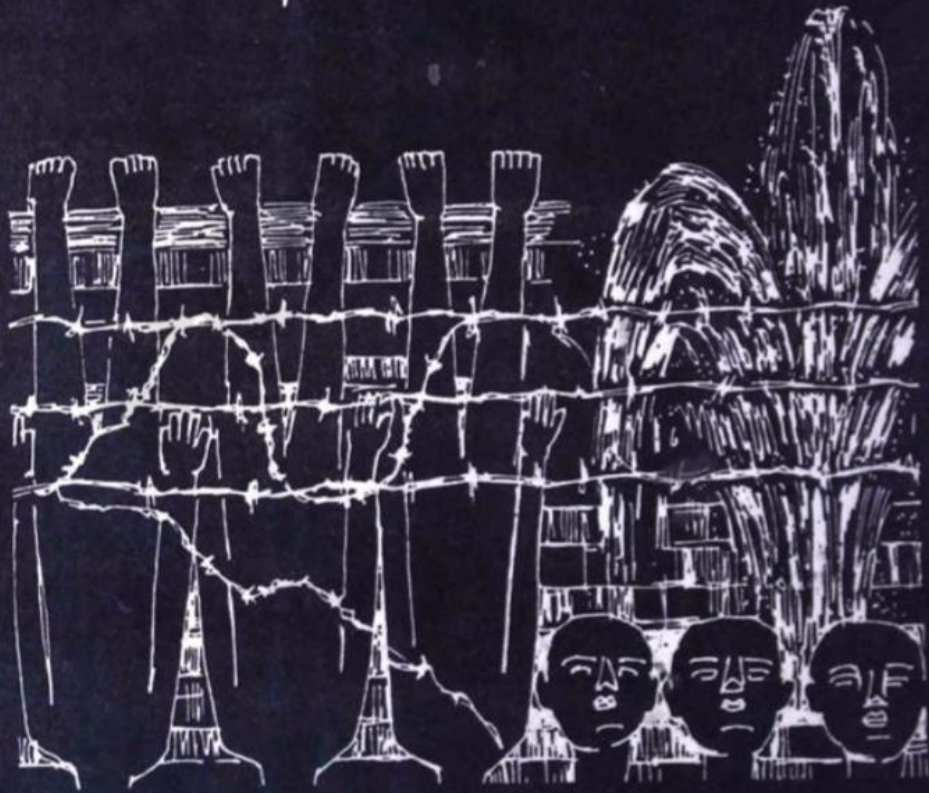
بہار کی
پسماندہ مُسلم آبادیاں
جابِر حُسین

کتاب : بہار کی پس ماندہ مسلم آبادیاں
مصنف : جابر حسین
اشاعت : ۱۹۹۴ء
تعداد : ۱۰۰۰
قیمت : دس روپیے
کتابت : نازنین بانو
ناشر : بہار فاؤنڈیشن، لوہیا نگر، پٹنہ

دستیاب :

- بہار فاؤنڈیشن، لوہیا نگر، پٹنہ
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
- ایمن پبلی کیشنز، سکندر منزل، پٹنہ
  بلاک 6/V نیو پونائی چک، پٹنہ

سنہولا، بھاگل پور کے اَسّی سالہ
جناب عبدالرؤف منصوری
کے نام

جنھوں نے
اپنے ہاتھوں مٹی کاٹ کر پیسے جُٹائے
اپنے بیٹے کو تعلیم دلوائی
اور
جو پسماندہ اقلیت آبادیوں
کی جدوجہد کی ایک
پُروقار علامت ہیں

یہ تحریریں

یہ تحریریں پٹنہ (بہار) سے شائع ہونے والے
کثیر الاشاعت اردد روزنامہ
"قومی تنظیم"
اور ہندی روزنامہ
"نو بھارت ٹائمز"
میں مارچ ۱۹۹۴ء تا مئی ۱۹۹۴ء
کے درمیان اشاعت پذیر ہوئیں۔

ناشر

اشاریہ

وہ اِسے نہ پڑھیں !

یہ کتابچہ بہار کی پسماندہ مُسلم اقلیتوں ، خصوصًا مسلم اقلیت آبادیوں کی زندگی کا سماجیاتی تجزیہ نہیں ہے ، اور نہ یہ کتابچہ پسماندہ مسلم آبادیوں کے مسائل کا کوئی نظریاتی آئینہ ہے ۔ اس لیے میری گذارش ہے کہ جو ذی علم حضرات پسماندہ اقلیت آبادیوں کی نفسیات اور سماجیاتی کش مکش کی باریکیوں سے باخبر ہونے کا لفظی دعوی کرتے ہیں ، وہ براہ کرم اس کتابچے کا مطالعہ کرنے کی زحمت نہ فرمائیں ۔ ان ذی علم اور ذی فہم حضرات کو اس کتابچہ میں جُھوٹ ، ریاکاری اور مصنوعیت کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آئے گا ۔

یہ کتابچہ کرایے پر لکھنے والے کسی قلم کار کی ذھنی تخلیق نہیں ، اور نہ یہ کتابچہ کسی سیاسی مصلحت پرستی کا لفظی جامہ ہے ۔

اس کتابچے کا ایک ایک حرف ان سچائیوں کی اندرونی پرتیں

کھولتا ہے، جو سالہا سال سے پسماندہ مسلم آبادیوں کی سماجی زندگی کی جڑیں کھودتی رہی ہیں، اور جو ہمیشہ پسماندہ مسلم آبادیوں کی آزادی اور آئینی حقوق کے لیے بھی ایک چیلنج رہی ہیں۔
یہ کتابچہ محض لفظوں کی تجارت نہیں ہے اور نہ کسی عہدے کی حصولیابی کے لیے کیا گیا فکری و عملی سودا ہے۔
یہ کتابچہ دراصل مسلم اقلیت آبادیوں کے مسائل سے تقریباً دو دہائی کے فکری، نظریاتی اور عملی رشتوں کی تاثراتی بنیاد ہے۔ یہ کتابچہ دراصل ہندوستان کی تمام پسماندہ آبادیوں کو ان کی سیاسی اور فکری غلامی سے آزاد کرنے والی عوامی جدوجہد کی ایک کڑی ہے۔
اس لیے میری گزارش ہے کہ جو ذی علم حضرات عوامی سطح پر سیاسی اور فکری غلامی کو روا رکھنا اپنا شیوۂ کار سمجھتے ہیں وہ اس کتابچے کو ہرگز نہ پڑھیں، کیونکہ یہ کتابچہ ان کے مصلحت پرست وجود پر ایک منفی تازیانے کا کام کرے گا۔

جابر حسین
۱۵۔ اگست ۱۹۹۴ء

سرکاری ملازمتوں میں

پسماندہ مسلم آبادیوں کی نمائندگی کا سوال

کیا وہ وقت آگیا ہے، جب اس بات کا محاسبہ ہونا چاہئے کہ مختلف کارپوریشنوں، محکموں اور دیگر اداروں میں گذشتہ پانچ برسوں کے دوران جو تقرریاں ہوئی ہیں، ان میں مسلم سماج کے پسماندہ طبقات کو کتنی نمائندگی حاصل ہوئی ہے؟ خاص طور پر کیا اس بات کا محاسبہ نہیں ہونا چاہئے کہ مسلم سماج کی پسماندہ اور انتہائی پسماندہ، پیشہ ور انسانی آبادیوں کے مفادات کی ترجمانی کرنے والے اداروں میں روزگار کی بندر بانٹ کرتے وقت استحصال زدہ مسلم آبادیوں کو کس قدر نمائندگی دی جاسکی ہے؟

میرے پاس ان سوالات کے جواب موجود ہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں ان سوالات کے جواب ان پیشہ ور انسانی آبادیوں کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والی تنظیموں کے کارکنوں اور رہنماؤں کی جانب سے دیا جائے تاکہ متعلقہ انسانی آبادیوں کے افراد کو ان تلخ سچائیوں کا پتہ چل سکے،

جوخود ان کی اقتصادی ترقی اور سماجی مساوات کے راستوں میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوتی رہی ہیں۔

اپریل ۱۹۹۲ء میں محکمہ راج بھاشا کے اردو پروگرام کے تحت ۲۴۹ منظور شدہ عہدوں میں سے ۲۲۹ عہدوں پر اردو ٹائپسٹوں کی تقرری کی گئی۔ پسماندہ طبقے کے دس محفوظ عہدوں پر تقرری کے لئے الگ سے اشتہار نکالے گئے۔ ان عہدوں پر پسماندہ مسلم طبقے کے امیدواروں کی تقرری کا فیصلہ آخری مرحلے میں سرکار کے زیر غور ہے۔

اردو ٹائپسٹوں کی منتخب فہرست تیار کرتے وقت ریزرویشن قوانین کو پوری سختی کے ساتھ نافذ کیا گیا تھا۔ یہی سبب ہے، غالباً پہلی بار مسلم سماج کے پسماندہ اور انتہائی پسماندہ طبقوں کو اجتماعی طور پر سرکاری ملازمتوں میں قابل ذکر نمائندگی حاصل ہو سکی۔

منتخب امیدواروں کی فہرست میں جہاں ایک طرف ۷۱ مسلم خواتین کے نام ہیں، وہیں پسماندہ اور انتہائی پسماندہ طبقوں کے لئے محفوظ سیٹوں کے علاوہ جنرل امیدواروں کے کوٹا میں بھی ۸۴ پسماندہ اور انتہائی پسماندہ امیدواروں کا انتخاب کیا گیا۔ خصوصی طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ امیدواروں کی اس مشترکہ فہرست میں پہلا، دوسرا، پانچواں اور ساتواں مقام مسلم سماج کے انتہائی پسماندہ امیدواروں کو حاصل ہوا۔

ان عہدوں کے علاوہ مختلف طبقوں کی محفوظ سیٹوں پر ۵۵ پسماندہ اور انتہائی پسماندہ امیدواروں کا انتخاب ہوا۔ اگر پسماندہ طبقے کی ۱۰ مزید سیٹوں کو اس فہرست میں شامل کر لیا جائے تو کامیاب امیدواروں کی فہرست میں پسماندہ اور انتہائی پسماندہ امیدواروں کی کل تعداد تقریباً ۱۵۰ ہو جائے گی۔

اس تقرری کا سب سے مثبت پہلو یہ ہے کہ صوبائی حکومت کے

ملازمتوں میں یقینی طور پر پہلی بار بہت بڑی تعداد میں مسلم سماج کی ان
آبادیوں کو نمائندگی دی گئی جو اب تک روزگار کے مواقع سے پورے طور
پر محروم رہی ہیں۔ میں ان آبادیوں میں خصوصی طور پر بنکر، راعین، مریاسن
کھٹک، قریشی، منصوری، چق، شیخڑا، بھاٹ، چوڑی ہارا، درزی اور رنگ
ریز برادریوں کے منتخب امیدواروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے
کئی مسلم برادریوں کے امیدواروں کو میرٹ میں کئی کئی جگہیں حاصل ہوئی
ہیں۔ یقینی طور پر اب تک صوبے کی سرکاری ملازمتوں میں ان اقلیت آباد
یوں کی نمائندگی 'نہیں' کے برابر رہی ہے۔

محکمۂ راج بھاشا کی مذکورہ تقرریوں کو آخری شکل دیتے وقت میں
نے اور میرے معاونین نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ مسلم سماج کی جن
آبادیوں کے بیچ تعلیمی سطح انتہائی پست ہے ان کے امیدوار متوقع تعداد
میں یا پھر آبادی کی مناسبت سے جگہیں حاصل نہیں کر سکے۔ مثال کے
طور پر نٹ، بکھو، ڈفالی، لال بیگی، شیر شاہ آبادی، ادریسیہ اور رنگ
ریز برادریوں کو اتنی تعداد میں جگہیں نہیں مل سکیں جتنی ملنی چاہیئے تھیں۔

اس کا ایک سبب ان آبادیوں کے بیچ تعلیم کا فقدان اور تکنیکی ٹریننگ
کے تئیں ان کی عدم توجہی ہے۔ مومن برادری کے امیدواروں کو ایک سو
سے زائد جگہیں حاصل ہونے کا سب سے بڑا سبب تکنیکی ٹریننگ کے
تئیں ان کی دلچسپی، کڑی محنت اور تعلیم کے ذریعہ اپنی اقتصادی، سماجی
حالت سدھارنے کی بے چینی ہے۔

صوبے میں مسلم سماج کی پیشہ گر برادریوں کی سماجی، اقتصادی حالت
سدھارنے کے لئے دست کاری ہاتھ کرگھا اور کئی دیگر بنکر تنظیمیں چل
رہی ہیں۔ ان تنظیموں میں بھی براہ راست یا بالواسطہ تقرریاں ہوتی رہتی
ہیں، یہ تنظیمیں دراصل مخصوص پیشہ ور اقتصادی جماعتوں کی ترقی کی غرض

سے قائم کی گئی ہیں۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں سے جو مالی امداد ملتی ہے، اسے ایک طرح سے ان مخصوص جماعتوں کے سماجی، اقتصادی ارتقاء پر خرچ کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا یہ ایک سچائی نہیں کہ ہاتھ کرگھا، دستکاری اور بنکری سے جڑی ان تنظیموں میں ملازمتوں کے سلسلے میں خود انہیں پیشہ ور برادریوں کے روزگار سے متعلق مفادات کا تحفظ نہیں ہو پاتا؟ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان تنظیموں کے ماتحت ہونے والی تقرریوں میں خود ان پیشہ ور انسانی آبادیوں کے ساتھ مکمل ناانصافی بلکہ ظلم برتا جاتا ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان تنظیموں کے سربراہوں کے ذریعہ براہ راست یا بالواسطہ جو تقرریاں عمل میں آئی ہیں۔ اگر ان کی فہرست اخبار کے کالموں میں شائع کرادی جائے تو پسماندہ مسلم آبادیوں کے نام پر جینے والی کئی مسلم تنظیموں کے چہروں سے فرض شناسی اور حق پسندی کی نقاب آپ سے آپ اُتر جائے گی۔

صوبائی حکومت کی پالیسی کے مطابق، اعلانیہ طور پر ملاحوں، پاسیوں اور کچھ دوسری پیشہ ور برادریوں کو ان کے روایتی پیشوں کی ادائیگی کے سلسلے میں کئی طرح کی اقتصادی سہولیات اور رعائتیں دی گئی ہیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ مسلم سماج کی بے شمار پیشہ ور پسماندہ آبادیوں کو پیشہ ورانہ رعائتیں دینے کا کام انتہائی سُست رفتاری سے چل رہا ہے؟ یہاں تک کہ وزیر اعلیٰ کے متعدد اعلانات کے باوجود قریشی برادری کے خواہشمند افراد کو مویشی ہاٹ بازار کی بندوبستی جیسا منصفانہ فیصلہ بھی کورٹ کچہری کی پیچیدہ مداخلتوں اور کچھ مخفی مفادات، مصلحت پسند اور موقع شناس سیاسی عناصر کی بیندھ ماری کا شکار ہو کر رہ گیا۔

نومبر ۱۹۹۲ء میں سپریم کورٹ نے سماجی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ جماعتوں کی حق پسندانہ نمائندگی اور شناخت کا جائزہ لینے،

پسماندہ اور انتہائی پسماندہ جماعتوں کو شامل کرنے یا ہٹانے کے لئے مرکز اور صوبائی سطحوں پر مستقل کمیشن کی تشکیل کی ہدایت دی تھی۔ عدالت نے ۱۴ر نومبر ۱۹۹۲ء کو جاری اپنے فیصلے کے پیراگراف 861 میں واضح طور پر اس بات کا ذکر کیا تھا کہ پسماندہ، انتہائی پسماندہ آبادیوں کے نام جوڑنے گھٹانے سے متعلق عام طور پر مرکزی اور صوبائی کمیشنوں کی سفارشیں متعلقہ حکومتوں کے لئے لازمی اہمیت کی حامل ہوں گی۔

عدالت کی اس ہدایت کی روشنی میں صوبائی قانون سازیہ کے ذریعہ پاس کردہ قانون کے تحت بہار میں پسماندہ طبقاتی کمیشن کی تشکیل عمل میں آچکی ہے۔ غالباً مکمل طور پر کمیشن کی تشکیل نہیں ہونے کے سبب یہ کمیشن اب تک اپنی متنوع ذمہ داریوں کی ادائیگی کی سمت عوامی سطح پر فعال شکل نہیں اختیار کر سکا ہے۔ جب تک یہ کمیشن مکمل طور پر فعال نہیں ہو جاتا اور خوبیوں، خامیوں کی بنیاد پر بہار کی پسماندہ اور انتہائی پسماندہ آبادیوں کی فہرست میں شامل کئے جانے کے دعویٰ کا اطمینان بخش حل تلاش نہیں کر لیا جاتا، بہار کی، خصوصی طور پر مسلم سماج کی محرومیت اور استحصال کی شکار آبادیاں ایک سنگین نفسیاتی کشیدگی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے منفی رجحان کے نازک دور سے گذرتی رہیں گی۔

صوبائی حکومت اور خود مسلم سماج کو بھی اپنی بے شمار اقتصادی سماجی اور تعلیمی کمزوریوں کی جانب پوری تندہی اور سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر سماجی انصاف کا انقلابی تصور کورا کاغذ ثابت ہوگا۔

●

کُلھیّا

برسوں قبل، راجدھانی سے تقریباً چالیس کیلومیٹر پورب، بختیار پور کے علاقے میں سڑک کے آس پاس خیموں میں رہنے والی بنجارا بکھو آبادی کی افلاس و دہشت زدہ زندگی سے متعلق ایک رپورتاژ لکھتے وقت میں نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ آدھی صدی کی آزادی کے باوجود ہم اب تک اُس شاہراہ کی تعمیر نہیں کر پائے ہیں جو بہار کے گاؤں کو دلّی سے جوڑ سکے۔ لیکن اس رپورتاژ کے لکھنے کے بعد جب اچانک مجھے دلی کے جمنا پارک علاقے میں ہزاروں ہزار بہاری مزدوروں کی اجاڑ بستی دیکھنے کا موقع ملا، تو برسوں قبل خود میری لکھی باتیں غلط ثابت ہوتی محسوس ہوئیں۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ بہار کے گاؤں کو دلّی سے جوڑنے والی شاہراہ وجود میں آچکی ہے۔ بھلے ہی یہ شاہراہ افلاس اور غربت کی شاہراہ ہی کیوں نہ ہو۔ بیشتر لوگوں کو، جو عوامی زندگی سے طویل وابستگی کا دم بھرتے ہیں، شاید

یہ معلوم نہ ہو کہ بہار کے پرانے پورنیہ ضلع کی تیس پینتیس ہزار مزدور آبادی اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے دلّی میں برسوں سے رہ رہی ہے۔

اس مزدور آبادی کا بیشتر حصّہ کوسی علاقے کی ایک انتہائی پسماندہ آبادی ـــــ کلہیا ـــــ سے متعلق ہے۔ اس آبادی کی علاقائیت دراصل اس کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ برادری صرف اور صرف کوسی علاقے میں ہی پائی جاتی ہے۔ تاریخ کی کتابیں، قصے کہانیاں اور دوسرے روایتی ذرائع سے حاصل ہونے والی اطلاعات کے مطابق یہ آبادی خصوصی طور پر کالی کوسی، پروان کنکئی اور بکرا ندیوں کے کنارے کنارے سینکڑوں برسوں سے رہتی آئی ہے۔ اس آبادی کا موازنہ خود اس علاقے کی دوسری آبادیوں سے بھی بہ آسانی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک وسیع تر سماجی زندگی کا حصّہ ہوتے ہوئے بھی اپنی اجنبیت اور بے شناختگی کے سبب یہ آبادی سماج کے دوسرے طبقوں سے کسی قدر علیٰحدہ اور مختلف نظر آتی ہے۔

اس آبادی کے درمیان گزشتہ کچھ مہینوں سے قدرے گہرائی کی سطح پر کام کرنے والے نوجوانوں کی ایک ٹیم نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ آبادی اپنی تہذیب، تمدن، رسم ورواج اور زبان کے لحاظ سے علاقے کی دوسری آبادیوں سے حد درجہ مختلف ہے۔

ایک اور لحاظ سے بھی یہ آبادی دوسری آبادیوں سے جدا نظر آتی ہے۔ ریاستی اور ملکی سطح پر سماجی اور تعلیمی نقطہ نظر سے پسماندہ آبادی کی فہرست میں اس آبادی کو شریک نہیں کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ تقریباً بارہ لاکھ کی اس آبادی کا مجموعی اعتبار سے محض تین فیصد حصّہ ہی حرف آشنا ہے۔ مردوں کے درمیان تعلیم کا تناسب پانچ فیصد ہے۔ جبکہ عورتوں کے درمیان یہ ایک فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ بعض لوگوں کو

یہ جان کر ممکن ہے تعجب ہو کہ سات سے پندرہ سال کی عمر کے بچوں کا ۹۵ فیصد حصّہ اسکولی تعلیم سے اپنے آپ کو الگ کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مزدور بچوں کا ۹۰ فیصد طبقہ مویشی چرانے، بیل گاڑی ہانکنے، ناؤ چلانے یا پھر صوبے سے باہر نوکری کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔

ایک ابتدائی نمونہ سروے رپورٹ کے مطابق سرکاری ملازمتوں میں اس آبادی کی نمائندگی انتہائی مایوس کن ہے۔ اب تک اس آبادی سے متعلق صرف ایک آئی پی ایس افسر جگہ پا سکا ہے، صرف چھ ڈاکٹر، ایک لیڈی ڈاکٹر، سات کالج اساتذہ، پچیس ہائی اسکول اساتذہ اور تقریباً ایک ہزار پرائمری اسکول اساتذہ ہیں۔ بہار پولیس میں اس آبادی کی نمائندگی صفر ہے۔

اس آبادی کا تقریباً ۹۹ فیصد حصّہ گاؤں میں رہتا ہے۔ شہروں میں بسی آبادی ۰۷۔ فیصد ہے۔ گاؤں میں ۹۹ فیصد سے بھی زیادہ لوگ کچے مکانوں یا جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ اس آبادی کا تقریباً پچاس فیصد حصّہ ساری عمر گاؤں کے مہاجنوں اور ساہوکاروں کے اقتصادی شکنجوں میں گرفتار رہتا ہے۔ پیڑھی در پیڑھی ان کی نسلیں اقتصادی سماجی غلامی کا شکار بنی رہتی ہیں۔

بنیادی طور پر اررریہ، پورنیہ، کشن گنج، کٹیہار اور سہرسہ کے پسماندہ علاقوں میں پھیلی ہوئی یہ آبادی صرف دلّی میں ہی نہیں، پنجاب، اترپردیش اور بنگال کے شہروں میں بھی مزدوری کرتی اور سماجی استحصال کا شکار ہوتی نظر آجائے گی۔ کہنے کو یہ آبادی کاشت کاری کے کام آنے والی آبادی ہے۔ لیکن کاشت کاری کے عمل میں اس کی کل حیثیت ٹریکٹر کے کسی پرزے سے زیادہ نہیں، جسے اشد استعمال کے بعد ٹریکٹر کی مشین سے باہر نکال کر پھینک دیا جاتا ہے، اور اس کی جگہ ایک نیا پرزہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ کلھیا آبادی مچھلی مارنے، سلائی کا کام کرنے اور لکڑی کے سازوسامان

تیار کرنے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ لیکن سرمایے کی کمی کے سبب ان کے لئے اپنے کار و بار کو فروغ دینا ممکن نہیں ہوتا۔

کلھیا آبادی سے متعلق قصے کہانیاں اور ان کی کلچرل زندگی کے حقائق سے روشناس ہونے پر بعض اوقات حیرت و استعجاب ہوتا ہے۔ وہ اب تک بھوت پریت کے توہمات، گیدڑ، لومڑی اور دوسرے جانوروں کے پیچھے بھاگ دوڑ کے حدود سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ خود کلھیا آبادی کے بیچ فلاحی پروگراموں کا منصوبہ لے کر ایمانداری اور فہم کے ساتھ کام کرنے والے نوجوان بھی اعتراف کرتے ہیں کہ کلھیا آبادی آج بھی تاریخ کے تاریک ترین عہد میں جی رہی ہے۔ صرف بھوت پریت ہی نہیں، ان کی نفسیات پر جن اور ڈائن، دیوی اور دیوتاؤں کی بددعاؤں کے منفی اثرات بھی کارفرما ہیں۔ وہ اب تک جان لیوا بیماریوں، قحط اور سیلاب کو دیوی دیوتاؤں اور قدرت کا عذاب مانتے ہیں۔

کلھیا آبادی کا تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ افراد کا حصہ عورتوں پر مشتمل ہے۔ کلھیا عورتیں سماجی اور اقتصادی اعتبار سے اور بھی زوال پذیر ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے پاس پہننے کے لئے ایک سے زیادہ کپڑا نہیں ہوتا۔ وہ نہانے اور پینے کے لئے ندی، تالاب اور گڈھوں میں جمع پانی کا استعمال کرتی ہیں، ان میں بیشتر چٹائی بُننے، جھاڑو بنانے، گوئٹھا تیار کرنے یا پھر کھیتوں میں مزدوری کا کام کرتی ہیں۔

اگر آپ بدحالی، غربت اور افلاس کو آدی باسی زندگی کی علامت تصور کرتے ہیں تو کلھیا آبادی کی عورتیں کسی بھی رُو سے آپ کو آدی باسی عورتوں سے مختلف نظر نہیں آئیں گی۔

بہار میں سماجی انصاف کے خوش آئند پس منظر میں کلھیا آبادی کے پیچیدہ مسائل پر غور کرتے وقت میں نے اکثر اپنے آپ سے سوال کیا ہے

ملک کے چالیس مسلم اکثریتی آبادی والے ضلعوں میں سے ہی ایک ضلع ہے پرانا پورنیہ، جس کے گرد و نواح میں بسی ہے یہ بدنصیب کلہیا آبادی جو دل کھول کر انتخابی سرگرمیوں اور ووٹ کی لہروں کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ لیکن انتخابی سرگرمیاں اور ووٹ کی لہریں جیسے بار بار ڈستی رہی ہیں۔ آخر آزادی کے اتنے برسوں بعد بھی ان خاموش آبادیوں کے بیچ فکر و نظر، سیاسی شعور اور جد و جہد کی کوئی لَو، کوئی چنگاری کیوں نہیں پھوٹی؟ یہ سوال جتنا آسان ہے اس کا جواب اتنا ہی مشکل ہے۔ لیکن اتنا تو ماننا ہی چاہئے کہ کلہیا آبادی کو اب تک جو سیاسی سبق پڑھایا جاتا رہا ہے، وہ سبق خود سپردگی اور شکست خوردگی کے علاوہ ذہنی غلامی کا سبق رہا ہے، جد و جہد، اولوالعزمی یا حوصلہ افزا عزائم کا سبق نہیں۔

حکومت ہند نے اپنے ایک اعلانیہ میں مسلمانوں کو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ آبادی تسلیم کیا ہے۔ لیکن حکومت ہند تمام مسلمانوں کو سماجی لحاظ سے پسماندہ آبادی تصور نہیں کرتی۔ حکومت ہند کی نظروں میں کوسی علاقے کی تاریک گپھاؤں میں غربت اور افلاس کے تھپیڑوں کے درمیان رُک رُک کر سانسیں لینے والی کلہیا آبادی کو بھی سماجی پسماندگی کا درجہ حاصل نہیں۔

میں کلہیا آبادی کو کسی ذات یا نسل کے بطور نہیں دیکھتا۔ میں اسے سماجی و معاشی استحصال سے دوچار ایک انسانی آبادی تصور کرتا ہوں۔ ہم میں سے ہر اس آدمی کو جو کسی حد تک سماجی ضمیر کا حامل ہے۔ کلہیا آبادی کے بنیادی مسائل کی جانب رجوع اور متوجہ ہونے کی ضرورت ہے ــــــ یہی دراصل سماجی انصاف اور پسماندہ آبادیوں کی دل جوئی کی سمت ہمارا پہلا قدم ثابت ہوگا۔

●

شیر شاہ آبادی

تاریخ میں ایسی مثالیں شاید کم دیکھنے کو ملیں گیں، جب ایک بڑی انسانی جماعت کے لئے کسی ایک فرد کا تاریخی نام اس کی شناخت بن جائے اور لوگ ایک آدرش کے بطور اس فرد کی خاندانی وراثت کو ڈھوتے چلیں۔ کوسی علاقے کے نصف درجن حلقوں اور سنتھال پرگنہ میں بسی شیر شاہ آبادی مسلمانوں کی تقریباً بیس لاکھ آبادی تاریخ کی ایک ایسی ہی غیر فطری مثال ہے۔

انگریزوں کے دور میں تیار کئے گئے ریکارڈ اور کچھ دوسرے دستاویزں کے مطابق شیر شاہ نے بنگال پر فتح حاصل کرنے کے بعد اپنی فوج کا ایک حصہ مرشد آباد اور مالدہ علاقوں میں اپنے فوجی مفادات کی محافظت کے لئے تعینات کر دیا تھا۔ کہتے ہیں شیر شاہ کی فوج کا یہ جنگجو دستہ درحقیقت پنجاب کی جانب سے آیا تھا۔ یہی وہ آبادی تھی

جس نے شیر شاہ کو اپنا ہیرو مانا، اور اس کے نام سے منسوب ہو کر شیر شاہ آبادی کہلائی۔

بعد کے دنوں میں اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے وسیلوں کی تلاش میں یہ آبادی پورنیہ علاقے میں منتقل ہو گئی۔ تاریخی ریکارڈ میں اس آبادی کو پورنیہ کے اصل باشندوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ لڑاکو، بہادر اور جسمانی لحاظ سے مضبوط مانا گیا ہے۔ ایک اوسط شیر شاہ آبادی دوسری جماعتوں کے مقابلے کئی گنا زیادہ دشوار گذار اور پر خطر کاموں کو انجام دینے کے لئے جانا گیا ہے۔ فوجی زندگی کی سخت ترین ٹریننگ اور اپنے وجود کی محافظت کے لئے خطرے اٹھانا ہی دراصل اس آبادی کی خصوصیات ہیں۔

اگر آج کی تاریخ میں اس آبادی کی طرح کوئی دوسری آبادی تلاش کرنی ہو تو ممکن ہے ہمیں بہار کے کوہان، مدھیہ پردیش کے شہدول اور اڑیسہ کے کالا ہانڈی علاقوں کا دورہ کرنا پڑے۔ یا پھر ممکن ہے ہمیں کیمور کی پہاڑیوں پر پسری کھروار اور چیرو آبادی کے بیچ اپنی نظریں دوڑانی پڑیں۔

اپنی جسمانی طاقت اور فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے شیر شاہ آبادی کھروار اور چیرو آبادی سے مشابہت رکھتے ہیں، لیکن چیرو اور کھروار جماعتوں اور شیر شاہ آبادی کے بیچ ایک بڑا فرق بھی ہے۔ کیمور پہاڑیوں پر قبیلہ جماعتوں کا اپنا سامراج رہا ہے۔ اس کے برعکس شیر شاہ آبادیوں کے لئے شیر شاہ کے بعد کوئی سامراج یا اقتدار نہیں رہا۔ ان کی تاریخ اچانک سماجی اور اقتصادی غیر مساوات کے کہرے میں ڈھک گئی۔

کچھ معنوں میں کھروار اور چیرو قبیلوں کو بھی انہیں حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاریخ نے ان کے سروں پر کرمنل ٹرائبس قانونوں کی دفعات مسلط

کردیں، اور وقت نے انہیں ایک مشکوک انسانی جماعت کے بطور پیش ہونے کے لئے مجبور کر دیا۔

کوسی علاقے کے نصف درجن ضلعوں اور پاکڑ صاحب گنج کے علاقے میں بسے شیر شاہ آبادی مسلمانوں کو شیر شاہ کا نام تو ضرور مل گیا، مگر انہیں شیر شاہ کی سماجی روایات سے منسوب احترام اور تقدس نہیں مل پایا۔

وسط بہار کے ضلعوں میں شیر شاہ کے سماجی وارثین انہیں اپنی برابری میں نہیں لاتے۔ ان کے لئے شیر شاہ آبادی مسلمان اجنبی ہو کر رہ گئے۔ لگ بھگ یہی رشتہ پورنیہ علاقے میں بسی دوسری آبادیوں اور اس جماعت کے بیچ بھی بن گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر سینکڑوں سال کی دشوار گزار لڑائیوں کے باوجود شیر شاہ آبادی مسلمان اپنی عدم شناختگی دور نہیں کر پائے ہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ کوسی علاقے کے آس پاس الگ الگ علاقے میں اس آبادی کو الگ الگ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ پرانے سہرسہ ضلع کے بیرپور علاقے میں انہیں مال دھیا، کشن گنج میں بھاٹیا، پورنیہ ارریہ، کٹیہار میں بدھیا اور صاحب گنج پاکڑ میں بیدیا نام سے پہچانا جاتا ہے۔ الگ الگ ناموں کو ایک ساتھ ملانے کی کوشش نہ تو سرکاری دستاویز کے معرفت ہوئی اور نہ سماجی سطح پر، یہی وجہ ہے، آزادی کے بعد بھی یہ آبادی آئینی محافظت، روزگار اور اقتدار میں حصہ داری کے مواقع سے پوری طرح محروم رہ گئی۔

شیر شاہ آبادی مسلمان اُردو زبان کو اپنی مادری زبان کی شکل میں قبول تو ضرور کرتے ہیں، لیکن بول چال میں وہ جس زبان کا استعمال کرتے ہیں، وہ دراصل اُردو، ہندی، بنگلہ زبانوں کی مخلوط شکل ہے۔ ان زبانوں

کے علاوہ کہیں کہیں میتھلی اور بھوجپوری نے بھی ان کی لسانیات کو متاثر کیا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ میتھلی اور بھوجپوری علاقوں سے یہاں آکر بسنے والے متمول خاندانوں کا اثر ہے۔

شیرشاہ آبادی مسلمانوں کا تقریباً 75٪ حصہ بے زمین ہونے کے باوجود کھیتی سے جڑا ہے۔ ایک سرکاری دستاویز میں انہیں اپنی محنت کا سودا کرنے والے طبقے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ شیرشاہ آبادی کے مزدوروں کے درمیان پچھلی دہائیوں میں زمین داروں کے ذریعہ مزدوری قوانین کی دھجیاں اڑائی جاتی رہی ہیں۔

شیرشاہ آبادی جماعت کا بیشتر حصہ بانس اور پھونس یا مٹی کے جھونپڑیوں میں رہتا ہے۔ بیشتر بستیوں میں نہ تو پینے کے پانی کا کچھ انتظام ہے اور نہ مکان کا۔ ان کی بستیوں تک پہنچنے کے لئے لوگوں کو لمبی دوریاں طئے کرنی پڑتی ہیں۔

اپنی مختلف کلچرل جڑوں کے باوجود شیرشاہ آبادی مسلمانوں نے رسم ورواج، طرز زندگی اور سماجی روایات کی شکل میں ان تمام اثرات کو قبول کیا ہے جو پورنیہ علاقے کے علاوہ صوبے کے دوسرے حصّوں میں بسے مسلمانوں کا خاصہ ہیں۔

شیرشاہ آبادی مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ آج بھی اپنے بچوں کو اسکول نہیں بھیجتا ہے۔ اس کے لئے خواندگی مشن کے نعرے بے معنی ثابت ہو چکے ہیں۔ اقتصادی دشواریوں کے سبب شیرشاہ آبادی مسلمان چاہیں بھی تو اپنے بچوں کو اسکولوں میں پڑھانے کا خرچ نہیں جٹا سکتے۔ انہیں کم عمری میں ہی اپنے بچوں کو کھیتی یا مزدوری کی ابتدائی ٹریننگ دے کر کمائی کے وسیلے کی شکل میں استعمال کرنے کی لاچاری ہوتی ہے۔

شیرشاہ آبادی جماعت کے درمیان سماجی، سیاسی بیداری پیدا

کرنے کی غرض سے تشکیل شدہ ایک ادارے نے جو ابتدائی سروے کیا ہے، اس کے مطابق مختلف ضلعوں میں شیر شاہ آبادی جماعت کے درمیان خواندگی کا فیصد درج ذیل ہے :-

کٹیہار	2%
پورنیہ	2.5%
ارریہ	3%
کشن گنج	3%
سہرسہ	3%
سپول	3%
کھگڑیا	3%
صاحب گنج	3%

شیر شاہ آبادی مسلمان تقریباً ڈیڑھ دہائیوں سے صوبے کی دوسری پسماندہ جماعتوں کے لئے منظور شدہ رعایات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے 77 - 1976 میں کٹیہار کے ضلع مجسٹریٹ نے اس آبادی کو انتہائی پسماندہ جماعتوں کی فہرست میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ راقم السطور کی کاوشوں سے سابق وزیر اعلیٰ کرپوری ٹھاکر نے ٹرائبل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، رانچی سے شیر شاہ آبادی مسلمانوں کی اس مانگ کا تجزیہ کرایا۔ مذکورہ انسٹی ٹیوٹ اور محکمہ فلاح نے 80-1979 میں اس جماعت کو انتہائی پسماندہ طبقوں کی فہرست میں شامل کرنے کی سفارش کی۔ تب سے لے کر آج تک تقریباً دس بار بہار کی مختلف سرکاروں نے 'ایوان قانون سازیہ میں اور اس سے باہر اس جماعت کی افلاس زدہ آبادی کو یہ یقین دلایا ہے کہ انہیں انتہائی پسماندہ طبقوں کی فہرست میں شامل کرتے ہوئے روزگار اور دوسرے معاملوں میں آئینی ضابطے کے تحت رعایات

دی جائیں گی ۔

1983ء اور 1988ء میں، دو بار وزیر اعلیٰ نے قانون سازیہ میں اور اس کے باہر متعلقہ محکمے کے افسران کو اس سلسلے میں فروری اقدام کرنے کا حکم دیا، لیکن یہ افلاس زدہ آبادی مستقل اپنے حقوق سے محروم رہی۔

ایک بار کٹیہار کے دور دراز علاقوں میں کیچڑ بھری پگڈنڈیوں پر چلتے وقت میں نے بانس کی قمچیوں سے بنی ٹوپی پہنے ایک شیر شاہ آبادی نوجوان سے پوچھا تھا ـــــــ شیر شاہ کی فوجی وراثت نے تمہیں غریبی اور غلامی کے علاوہ اور کیا دیا ہے؟ ایک بار میں نے دن بھر کی تھکا دینے والی دوڑ دھوپ کے بعد تقریباً نصف رات کو کسی شیر شاہ آبادی نوجوان کی جھونپڑی میں مٹی کی ایک ہانڈی میں گھگھنی اور موڑھی چباتے وقت اس سے پوچھا تھا ـــــــ کیا تم نہیں سوچتے کہ صدیوں قبل شیر شاہ نے تمہارے پرکھوں کو اپنی فوج سے الگ کر کے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا؟

دونوں بار مجھے ایک جیسا جواب ملا تھا ـــــــ ہم اب بھی خود کو لڑائی کے مورچے پر مانتے ہیں اور شیر شاہ اب بھی ہمارا ہیرو ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ شیر شاہ کو اپنا ہیرو مانتے رہنے کی وجہ سے ہی شیر شاہ آبادی کو آزادی کے لگ بھگ پچاس برس بعد بھی استحصال کا شکار ہونا پڑ رہا ہے؟

●

شیشہ گر

چلچلاتی دھوپ کس نے نہیں دیکھی ؟ لیکن چلچلاتی دھوپ میں اپنے سروں پر کانچ کی رنگ برنگی چوڑیوں کا چنگیرا سنبھالے ایک گھر سے دوسرے گھر تک ، ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک چکر لگاتی عورتوں کو کتنے لوگوں نے دیکھا ہے ؟ شمالی بہار کے بااثر مسلم گھرانوں کی بستیاں ہوں یا وسط بہار کے پسماندہ گاؤں، سنتھال علاقے کی تاریک جھگیاں ہوں یا جھارکھنڈ علاقے کی مٹی کی مڑئی ، کانچ کی چوڑیوں کا چنگیرا سنبھالے اکا دکا عورتیں آپ کو ہر جگہ مل جائیں گی ۔

یہ عورتیں الگ الگ علاقے میں الگ الگ نام سے جانی جاتی ہیں۔ کہیں انہیں چوڑی ہارن کہا جاتا ہے اور کہیں چوڑی فروش ۔ کہیں انہیں شیشہ گر اور کہیں چوڑی والان کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے ۔ حال کے دنوں میں بدلتے سماجی حالات کے پیش نظر اس آبادی کے بیدار مغز افراد کی کوششوں

سے اس آبادی نے اپنے لئے ایک مہذب نام ـــــ صدیقین ـــــ ڈھونڈ لیا ہے ۔ اگر آپ نے میری طرح سنگھ بھوم، لوہردگا، گوملا اور کھونٹی کے دور دراز علاقوں میں اپنی زندگی کا تھوڑا عرصہ بھی گزارا ہے تو آپ شیشہ گروں کی آبادی کے نمائندہ چہروں سے ضرور واقف ہوں گے۔

قدرت نے مجھے کسی شیشہ گر کی کوکھ سے جنم لینے کا شرف نہیں بخشا لیکن اس نے مجھے شیشہ گروں کی آبادی کے اُداس من کو پڑھنے، سمجھنے اور اسے شدت سے محسوس کرنے کی صلاحیت ضرور بخشی ہے۔ بچپن کے دنوں میں اپنے گھروں میں چلچلاتی دھوپ سے گزر کر آنے والی ان شیشہ گر عورتوں کو میں نے اکثر اپنی ماں اور بہنوں کی کلائیوں میں چوڑیاں ڈالتے دیکھا ہے۔ چوڑیاں ڈالتے وقت اکثر میں نے ان شیشہ گر عورتوں کے نجی تجربوں سے پیدا ہونے والی تلخی بھی محسوس کی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ جب ایک دن شیشہ گر عورتوں کی ایک جماعت اپنی دوکانوں کی لوٹ اور پولیس کی زیادتیوں کا بیورا لے کر میرے پاس آئی تو میں دل کی گہرائیوں تک پگھلنے سے اپنے آپ کو نہیں روک سکا۔ میں نے اس وقت تک چین کی سانس نہیں لی، جب تک ان شیشہ گر عورتوں کی دوکانیں انہیں واپس نہیں مل گئیں۔

شیشہ گری کا یہ پیشہ کئی معنوں میں انوکھا ہے۔ اس پیشے میں مرد اور عورتیں ایک ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ کم عمری میں ہی شیشہ گر گھرانوں کے بچے، بچیاں تعلیم اور اسکولوں سے دور زندگی کے وسائل ڈھونڈنے میں لگ جاتے ہیں۔ ایک بار حرف آشنائی سے دور چلے جانے پر شیشہ گر بچے، بچیاں کبھی دوبارہ حرف آشنائی کی جانب متوجہ نہیں ہو پاتے۔ کم عمر میں ہی شیشہ گروں کی بچیوں کا بیاہ ہو جانا، تاکہ وہ خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ پھیری لگانے کے کام میں جُٹ سکیں، ایک عام

بات ہے۔ ۱۹۷۶ء میں تیار کی گئی ایک دستاویز کے مطابق بہار میں شیشہ گروں کی کل آبادی ساڑھے پانچ لاکھ مانی گئی تھی۔ جس میں نصف سے کچھ کم تعداد عورتوں کی بتائی گئی تھی۔ اس وقت ان کی آبادی تقریباً بارہ لاکھ ہے۔ عورتوں کی تعداد کا فیصد تقریباً پہلے کی طرح ہے۔

سرکاری ریکارڈ میں درج اطلاعات کے مطابق شیشہ گر آبادی کا تقریباً ۹۰٪ حصہ دیہی علاقوں میں بسا ہے۔ لیکن پیشے اور کاروبار کے مجبوریوں کی وجہ سے شیشہ گر خاندانوں کو گاؤں سے شہر کی دوڑ لگانی پڑتی ہے۔

اس آبادی کا 85 سے ۹۵ فیصد حصہ نہ صرف بے زمین اور مفلس ہے، بلکہ ناخواندگی کی آخری سیڑھیوں پر بھی ہے۔ مونگیری لال کمیشن نے دوران تحقیق انہیں شیشہ گر گھرانوں کو معاشی اعتبار سے قدرے بہتر پایا' جو اپنا پیشہ چھوڑ کر کسی دوسرے روزگار میں لگ گئے تھے۔

کمیشن کے مطابق شیشہ گروں کی ایک بڑی آبادی اپنے پیشے سے باہر صنعتی کاریگری کی طرف مراجعت کر چکی ہے۔ پھر بھی اس وقت کے آنکڑے کے مطابق شیشہ گر آبادی کا تقریباً ۶۰٪ حصہ عام مزدوری کا کام کرتے ہوئے اقتصادی، سماجی استحصال کا شکار ہو رہا ہے، دراصل یہ طبقہ مسلم سماج کے ان طبقوں میں سے ایک ہے' جو ناخواندگی' عدم واقفیت، سیاسی ناعاقبت اندیشی اور استحصال کی آخری منزل میں جی رہا ہے۔

سماجی استحصال کی شکار شیشہ گروں کی یہ آبادی برسوں سے اپنے جائز آئینی حقوق سے لگاتار محروم ہے۔ حقوق سے محروم رہنے کی لاچاری نے انہیں اس حد تک بے حس بنا دیا ہے کہ انہیں اکثر اپنے آپ کو کھلے عام شیشہ گر برادری کا خود کہلانے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔

شیشہ گروں کی ایک معتبر تنظیم نے خود اپنی دستاویز میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

مونگیری لال کمیشن نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اس پیشے کو سماجی لحاظ سے حقیر اور ہیچ سمجھا جاتا ہے۔ کمیشن نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ شیشہ گروں کی اوسط آمدنی اس درجہ قلیل ہے کہ ان کی زندگی کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ ظاہر ہے صوبے کی پسماندہ آبادیوں کے درمیان تعلیم کو اب تک صحیح معنوں میں ایک بنیادی ضرورت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

نئے مزاج کی عورتوں کے درمیان چوڑیوں کے استعمال میں ایک طرح کی بے توجہی دیکھی جا رہی ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ہری ہری چوڑیوں کے سنہرے گیتوں کے باوجود عام گھرانوں میں نئی عمر کی لڑکیوں کے درمیان رنگ برنگی چوڑیوں کی مقبولیت گھٹ رہی ہے۔ اس وجہ سے بھی شیشہ گر آبادی کی اقتصادی حالت میں مزید گراوٹ آئی ہے۔

بڑے شہروں میں کانچ کی چوڑیوں کے بڑے بڑے کلر خانے، منڈیوں اور دکانوں کو دیکھ کر کسی بھی آدمی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ شیشہ گروں کا کاروبار اقتصادی اعتبار سے کافی ترقی یافتہ اور خوشحال ہے۔ ایسا سوچنا سچائی پر پردہ ڈالنا ہوگا ــــــ سچائی یہ ہے کہ چوڑیوں کے اس ترقی یافتہ کاروبار پر ان شیشہ گروں کی گرفت نہیں ہے۔ دراصل اس کاروبار پر ان سرمایہ داروں کی اجارہ داری ہے، جو صوبے یا ملک کی اقتصادیات کو اپنے شکنجے میں رکھنا جانتے ہیں۔

ایک سچائی یہ بھی ہے کہ صوبائی حکومتوں کی حوصلہ شکن پالیسیوں کے سبب اگر کسی شیشہ گر نے اپنی صنعتی اکائی کھڑی کرنے کی ہمت بھی جٹائی تو اسے سرمایہ داروں کی سازشوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینا ہوگا۔

کچھ عرصہ قبل ایک سروے کے مطابق شیشہ گر آبادی میں آئی۔اے پاس طلبا اور طالبات کی کل تعداد 300، بی۔ اے پاس کی تعداد 125، ام۔ اے پاس کی تعداد صرف 25 اور تکنیکی ڈپلوما حاصل کرنے والوں کی تعداد محض 30 تھی۔اس تعداد میں طالبات کا حصہ نہیں کے برابر ہے۔اس صورت حال میں کسی بھی قابل ذکر تبدیلی کے آثار نہیں ہیں۔

سرکاری نوکریوں میں بھی شیشہ گر آبادی کی نمائندگی نام برابر ہے جو ہیں وہ تیسرے اور چوتھے درجے کی نوکریوں سے آگے نہیں بڑھے۔ظاہر ہے صوبائی سطح کی نوکریوں میں اس برادری کی تعداد صفر ہے۔

دسمبر ۱۹۸۰ء میں شیشہ گر آبادی کا ایک نمائندہ وفد دلّی جا کر محترمہ اندرا گاندھی سے ملا تھا۔ وفد نے محترمہ اندرا گاندھی سے شیشہ گروں کو انتہائی پسماندہ طبقات کو ملنے والی سہولیات دلانے کی گزارش کی تھی۔ کہتے ہیں محترمہ اندرا گاندھی نے شیشہ گروں کی دستکاری کو فروغ دینے اور انہیں اقتصادی امداد فراہم کرانے کی تجویز پر رضا مندی کا اظہار کیا تھا۔محترمہ اندرا گاندھی نے شیشہ گروں کے کاروبار کو پونجی یا سرمایہ شاہوں کے چنگل سے آزاد کرانے کا حکم دیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم محترمہ اندرا گاندھی کا یہ حکم ان کے عملوں نے کس کوڑے دان میں ڈال دیا۔

شیشہ گروں کی انصاف کی یہ مانگ آج بھی جیوں کی تیوں برقرار ہے۔سماجی انصاف کے نعروں کی بازگشت میں ان کی یہ مانگ اور بھی تیز ہو گئی ہے۔

اپریل ۱۹۹۲ء میں اقلیتی کمیشن کی ایک رپورٹ میں سماجی سچائیوں کی روشنی میں شیشہ گروں کی اس مانگ کو منصفانہ طور پر لازمی قرار دیا گیا ہے۔

صوبے کی شیشہ گر آبادی، فطری طور پر کسی سرکار کے لئے الجھن اور تناؤ کا سبب نہیں بننا چاہتی، شاید یہی سبب ہے کہ ڈیڑھ دہائیوں سے ان کی یہ مانگ سرد خانے میں پڑی ہے۔

لیکن ان باتوں سے الگ شیشہ گر عورتیں، جو ہمارے آپ کے گھروں کی کلائیوں کا حسن بڑھاتی ہیں، اپنی سماجی ذمہ داریوں کے تئیں حد درجہ بیدار اور حساس ہیں۔ وہ فخریہ انداز میں ان دنوں کو یاد کرتی ہیں جب نیتاجی سبھاش چندر بوس، کلکتے کی ایک جیل میں نظر بند تھے۔ اور محترمہ ارونا آصف علی کی تحریک پر کچھ عورتیں بندی خواتین کو کانچ کی چوڑیاں پہنانے کا بہانہ لے کر جیل میں داخل ہوئی تھیں اور جنہوں نے نیتاجی سبھاش چندر بوس کو شیشہ گر عورتوں کی پوشاک پہنا کر، ان کے سر پر کانچ کی چوڑیوں کا چنگیرا ڈال کر انہیں جیل سے باہر نکلنے کا موقع فراہم کیا تھا۔

مجھے شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کانچ کی چوڑیوں کا چنگیرا لے کر، جیل میں داخل ہونے والی شیشہ گر عورتوں کو اس واقعے کے بعد ایک لمبی مدت تک جیل میں نظر بند رہنا پڑا تھا۔

●

سلائی کامگار

وہ صرف شادی کے جوڑے اور پرب تہواروں کے کپڑے نہیں تیار کرتے، وہ کفن بھی تیار کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ خوبرووں کے لئے لباس بدن، لیکن ستم گروں کے لئے کفن سیتے ہیں۔

آپ چاہیں تو انہیں درزی کہہ لیں یا ادریسیہ، یا پھر سلائی کامگار، مگر وہ رہیں گے اپنے باکمال ہاتھوں سے کپڑوں کی کاٹ تراش کرنے والے اور اپنے کاٹے تراشے کپڑوں کو دوبارہ جوڑنے والے۔

کپڑوں کی کاٹ تراش اور جوڑ کے علاوہ وہ کپڑوں کی گرہیں کھولنے اور نئی گرہیں لگانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ ان کا کام کپڑوں کی بخیہ ادھیڑنا اور چیتھڑا چیتھڑا کپڑوں کی رفوگری بھی ہے۔

ہر گاؤں، ہر شہر، ہر محلے، ہر گلی میں بڑی دکانوں سے لیکر فٹ پاتھ تک آپ کو رفوگری میں ماہر اس آبادی کے نمائندے دیکھنے کو مل جائیں گے۔

رُت بسنت کی ہو یا پت جھڑ کی، گھروں سے باہر اولے پڑ رہے ہوں، شیت لہری چلتی ہو، یا پھر جیٹھ کی دوپہر میں آگ برستی ہو، پاؤدان پر اپنے پیر رکھے، ہر موڑ پر انگنت رفوگر اپنے کام میں معروف مل جائیں گے، قسم قسم کے فیشن اور ماڈل کے کپڑوں کی سلائی کرتے، چست اور ڈھیلے ڈھالے، تنگ اور کشادہ۔

ایک اندازے کے مطابق، صوبے میں اس آبادی کی تعداد تقریباً ۲۰ لاکھ بتائی گئی ہے۔ اس بڑی تعداد کے باوجود اب تک اس آبادی کے درمیان کوئی منظم اور لڑاکو سیاسی، سماجی لیڈرشپ نہیں ابھر پائی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مسلم سماج کے پسماندہ طبقوں میں یہ آبادی اپنے مطالبات منوانے کے سلسلے میں اب تک صوبائی سطح پر کوئی منظم تحریک چلانے کی سمت قابل ذکر پیش رفت نہیں کر پائی ہے۔

۱۹۸۱ء میں راقم السطور کی صدارت میں سلائی کامگاروں کی ایک صوبائی سطح کی تنظیم وجود میں آئی تھی۔ یہ تنظیم کوئی ذات پرست مورچہ نہیں تھی۔ اس کی بنیادی ترجیحات کامگاروں کو مناسب مزدوری دلانا اور انہیں روزمرہ کے استحصال سے بچانا تھیں۔

۱۹۸۱ء، ۱۹۸۲ء اور ۱۹۹۳ء میں سلائی کامگاروں نے کئی جگہوں پر اپنے مطالبات منوانے کے لئے دو دو، تین تین ہفتوں تک ہڑتال کرائی اور کئی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ ایک بار سلائی کامگاروں نے ۱۲ دنوں کی ہڑتال کے بعد اپنے مطالبات منظور کرائے تھے۔

سلائی کامگاروں کی بیشتر لڑائیاں اپنے مالکوں کے خلاف رہی ہیں۔ جو مزدوری کے معاملے میں نہ صرف اپنے کامگاروں کے ساتھ ناانصافی برتتے رہے ہیں، بلکہ جو انہیں اپنی کمائی کا ذریعہ مانتے ہوئے بھی استحصال کی حالت میں رکھتے ہیں۔

سلائی کامگاروں کے مسائل سے جڑتے وقت، برسوں قبل مجھے اس روزگار میں خواتین کامگاروں کا فیصد دیکھ کر سخت حیرت ہوئی تھی۔ دراصل اس روزگار میں لگے لوگوں کی تعداد کا اندازہ لگاتے وقت خواتین کام گاروں کی تعداد پر گہرائی اور سنجیدگی سے غور نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کا ایک سبب غالباً خواتین کی پردہ نشینی ہے۔ جس کے تحت خواتین کامگار لوگوں کی نظروں سے بچ کر اپنے اپنے گھروں میں سلائی کا کام کر کے اپنی معاشی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر خواتین خصوصی طور پر کشیدہ کاری کے فن سے وابستہ ہیں۔

پٹنہ سیٹی علاقے کے کچھ سلائی کامگاروں، خصوصی طور پر خواتین کامگاروں کی سروے رپورٹ تیار کرتے وقت ایک خاتون کامگار نے یہ کہہ کر مجھے سخت متحیر و ششدر کر دیا تھا کہ اُسے دکان مالکوں کے لئے نصف درجن بلاؤز کی سلائی کے عوض میں صرف ۳ر روپے مزدوری کے بطور ملتے ہیں، جب کہ ایک بلاؤز کی سلائی کے لئے دکان مالکوں کے ذریعہ گاہکوں سے ۸ر سے ۱۶ر روپے تک کی رقم وصول کی جاتی ہے۔

اُن دنوں مسلم سماج کی اس پسماندہ آبادی کی معاشی بدحالی پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہوئے میں نے کچھ ابتدائی پیش قدمی کی تھی۔ اس کام میں اس آبادی کے کچھ ہونہار نوجوانوں نے ذات برادری کی حدود سے پرے میری تحریکوں کی زبردست حمایت کی تھی۔

ان تحریکوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۸۶ء میں ہیموتی نندن بہوگنا اور کرپوری ٹھاکر کی قیادت میں نکالی گئی ایک زبردست عوامی ریلی کے بعد گورنر بہار کو سونپی گئی عرضداشت میں غالباً پہلی بار سلائی کامگاروں کی واجب مزدوری مقرر کرنے کا مطالبہ شامل کیا گیا۔

ان دنوں مسلم سماج کے پسماندہ طبقوں کے مسائل و مطالبات کے

لئے جدوجہد کرنا متعلقہ پیشہ گر آبادیوں کی ذات پرست اجارہ داری کو چیلنج کرنا نہیں تھا۔ اور نہ یہ سماجی اصول منظر عام پر آیا تھا کہ مخصوص سماجی برادریوں کی تحریک ان برادریوں میں جنمے افراد کی رہنمائی میں ہی چلنی چاہئے۔

تقریباً یہی وہ وقت تھا، جب ۱۹۸۴ء میں گورنر بہار جناب اخلاق الرحمن قدوائی نے گہرائی میں جاکر سلائی کامگاروں کے معاشی مسائل اور سماجی پسماندگی دور کرنے کی سمت پہلے قدم کے طور پر سلائی کامگاروں کی واجب مزدوری طے کرنے کے لئے لیبر کمشنر کی صدارت میں ایک سات رکنی کمیٹی کی تشکیل کی تھی۔

مجھے نہیں معلوم اس کمیٹی نے اپنی کوئی سفارش طے کی یا نہیں۔ اگر طے کی تو اس کی روشنی میں ریاستی حکومت کی کوئی واضح پالیسی بنی یا نہیں۔ سلائی کامگاروں کے مسائل سے اب تک وابستہ لوگ بھی اس کمیٹی کی سفارش اور اس کی روشنی میں سرکار کے ذریعہ کئے گئے فیصلے سے پوری طرح ناواقف ہیں۔

آج کی تاریخ میں سلائی کامگار آبادی نے واجب مزدوری کے سوال کے علاوہ دو اور مطالبات پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ آج وہ جہاں ایک طرف اس آبادی کو انتہائی پسماندہ آبادی کی شکل میں منظور کئے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہیں ان کے درمیان ایک بیدار طبقہ اپنے معاشی سماجی اور تعلیمی حالات سدھارنے کے لیے منصوبہ بند اور وسیع تر اقتصادی سماجی پروگرام اور پالیسیوں کی مانگ کر رہا ہے۔ اس طبقے کے مطالبات میں سلائی کامگاروں کی اقتصادی ترقی کیلئے مالیاتی کارپوریشن کی تشکیل، بیمہ اسکیم کا نفاذ اور تعلیم کے خصوصی مواقع کی گارنٹی شامل ہیں۔

سلائی کامگاروں کے بیچ کام کرتے وقت میں نے ان کی خواندگی

اور معاشی بدحالی کی سینکڑوں مثالیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ ان مثالوں کا ذکر کیا جائے تو مجھے ایک الگ باب لکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ میں اس وقت اتنا کہہ کر بس کرنا چاہوں گا کہ سلائی کامگاروں کے بیچ ہر تیسرا آدمی آنکھ کی کسی سنگین بیماری کا شکار ہے۔ سلائی کے بڑے کارخانوں میں غیر صحت مند حالات اور مال نیوٹریشن کے سبب وہ دوسری مختلف بیماریوں کے بھی شکار ہوتے رہے ہیں۔

مارچ ۱۹۹۳ء میں اقلیتی کمیشن نے کامگاروں کی اس بڑی آبادی کو اقتصادی، سماجی، تعلیمی سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے ایک تجویز صوبائی حکومت کو بھیجی تھی۔ ہنوز یہ تجویز محکمہ پرسنل کے زیر غور ہے۔

ہماری دقت یہ ہے کہ ہم مسلم سماج کے پسماندہ طبقوں کے تئیں اپنی مکمل ذمہ داری کو روزگار کے ہر روز سکڑتے دائرے میں رکھ کر سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے پسماندہ آبادیوں کے درمیان انسانی رشتوں کے دھاگے مضبوط ہونے کی بجائے کمزور پڑ رہے ہیں۔ اور پسماندہ آبادیوں کے درمیان سماجی رسّہ کشی کے ایک تکلیف دہ دور کا آغاز ہو گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم مسلم سماج کے ان پسماندہ طبقوں کو روزگار کے محدود مواقع اور سماجی رسّہ کشی کے کھونٹوں سے باندھ کر کب تک کامیاب ہو سکیں گے؟ کیا ایسا کر کے ہم مسلم سماج کے پسماندہ طبقوں کے تئیں اپنی وسیع تر ذمہ داریوں اور فرائض سے بری ہو سکیں گے؟

کیا یہ معائنہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم نے آزادی کے پچاس برسوں کے دوران قومی وسائل کا کتنا فیصد حصّہ ملک کی دوسری آبادیوں کے ساتھ ساتھ مسلم سماج کے پسماندہ طبقوں کی ترقی میں لگایا ہے؟

مجھے یقین ہے ان سوالوں کے جواب عوامی سطح پر مسلم سماج کے دانشور طبقوں کے ساتھ ساتھ عام شہریوں کو بھی سیاسی سچائیوں کے کچھ نئے پہلوؤں اور نئی جہتوں سے روشناس کرائیں گے۔

•

بُنکر

کوئی لمبی مدت نہیں گزری، جب ڈیوڈ منجنی نے 'جولہا کولہا — بھائی بھائی' کا نعرہ دے کر چھوٹا ناگ پور میں بسی اقلیت آبادیوں کو تھوڑے وقفے کے لئے چونکا دیا تھا، اور برسوں سے اس علاقے میں اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کے نام نہاد محافظ اور مسیحا کی امیج بنائے رکھنے والوں کو ڈیوڈ منجنی کے اس نعرے سے اپنی سیاسی، سماجی اجارہ داری ٹوٹنے کا خطرہ محسوس ہوا تھا۔

صرف ڈیوڈ منجنی ہی نہیں، برسوں بعد کڑکھ زبان کے اچھے واقف کار الحاج ٹرکی نے بھی اس علاقے میں بسی مسلم آبادی کی ثقافتی جڑوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اسلام مذہب قبول کرنے سے پہلے چھوٹا ناگ پور کی اس آبادی کے پُرکھے دراصل اراؤں قبیلے سے آئے تھے۔

صرف ڈیوڈ مینمنی اور الحاج ٹرکی ہی نہیں، قبیلہ زبانوں اور تہذیب کے اچھے واقف کار علی محمد انصاری بھی اراؤں اور اس مسلم آبادی کے درمیان زہنی سطح پر پائی جانے والی مشترکہ خصوصیات کی بنیاد پر مانتے ہیں کہ چھوٹا ناگپور علاقے میں کثیر تعداد میں بسی پسماندہ مسلم آبادی کے اجداد اراؤں تھے۔

کہنا مشکل ہے کہ چھوٹا ناگپور کی اس پسماندہ مسلم آبادی کو جولاہا کا خطاب کس نے دیا، بدیسی گوروں نے یا دیسی گوروں نے؟ بدیسی گورے انہیں یہ خطاب آخر کیسے دے سکتے تھے؟ ان کی ڈکشنری میں ایسی آبادیوں کے لئے کرمنل ٹرائب یا جرائم پیشہ قبیلہ جیسے الفاظ موجود تھے۔ اس کے علاوہ بدیسی گوروں کے جھارکھنڈ بستیوں تک پہنچنے کے پہلے ہی آدی باسی قبیلوں کے بیچ اسلام مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا کام بڑی حد تک شروع ہو چکا تھا۔ تو کیا بااثر مسلم دیسی گوروں نے ہی اس نومسلم قبیلہ آبادی کو جولاہا کہہ کر مخاطب کیا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انتہائی دشوار گزار اور مخالف حالات میں جنگلوں میں رہنے والی یہ آبادی، ان دنوں پوری طرح ان پڑھ اور ناخواندہ تھی۔ ممکن ہے جن دیسی گوروں نے اس آبادی کو ناخواندگی کے بنیاد پر 'جہلا' کا خطاب دیا، ان کی نیت میں کھوٹ نہیں ہو۔ لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ اس خطاب نے آگے چل کر ایک منفی اور توہین آمیز شکل اختیار کرلی۔ اور یہ لفظ پوری آبادی کے لئے ایک غیرمہذب شخصی پہچان بن گیا۔

سماجی تاریخ بتاتی ہے کہ اس آبادی کے درمیان ترقی اور سُدھار سے متعلق وقتاً فوقتاً موثر تحریکیں چلائی جاتی رہی ہیں۔ اس آبادی کے درمیان سماجی اور سیاسی لیڈرشپ بھی ابھرتی رہی ہے۔ آگے چل کر یہ

آبادی مومن کے نام سے جانی گئی۔ لیکن جھارکھنڈ کے شہری اور نیم شہری علاقوں میں بسی مومن برادری کو اگر الگ کر دیں تو آج بھی اس آبادی کا بیشتر حصّہ آدی باسی قبیلوں کی المناک زندگی جی رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب فکری سطح پر اپنی تفریح کے لئے جھارکھنڈ کے دیسی گوروں نے اس آبادی کو احمقوں کی جماعت کہہ کر پکارا تھا۔ اور ان کی حماقت سے منسوب متعدد مثالوں کو مقبول عام لوک کتھاؤں کی شکل میں مشتہر کیا تھا۔ یہ قدم دراصل آدی باسی نسل کی سیدھی سادی، ایماندار اور معصوم پسماندہ مسلم آبادیوں کو اپنے ثقافتی شکنجوں میں جکڑنے کی ایک چالاک کوشش تھا۔

مومن آبادی کا ایک بڑا حصّہ کھیت مزدوری اور بنکری سے جڑا ہوا ہے۔ یہی اُس کا ذریعہ معاش بھی ہے۔ لیکن بنکری کے وسائل پر تو جاگیردار طبقے کے بڑھتے اثرات نے ان سے روزگار کے مواقع چھین لئے۔ اب وہ لاچار ہو کر دوسرے پیشوں کی جانب رجوع ہو رہے ہیں۔

جھارکھنڈ اور سنتھال علاقوں میں مسلم آبادی کا کوئی فرد رکشہ ہانکتا، اینٹ بھٹوں میں کام کرتا، چائے دکانوں اور ہوٹلوں میں میز ملے صاف کرتا یا پھر کھیتوں میں مزدوری کرتا نظر آجائے تو اس سے اسکی برادری پوچھنے کی قطعی ضرورت نہیں۔

کھیتوں میں آدی باسی خواتین کامگاروں کے ساتھ اپنی پیٹھ پر شیرخوار بچوں کا گٹھر باندھے، کام میں مشغول اگر آپ کو کوئی مسلم خاتون مل جائے تو اس سے بھی اس کی برادری کا نام پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ پورے بھروسے کے ساتھ انہیں مومن آبادی کا رکن مان سکتے ہیں۔

یہی وہ آبادی ہے جو ست بروا سے لے کر لوہردگا تک، جگن ناتھ پور سے لے کر کھونٹی تک، اور گملا سے لے کر شکاری پاڑہ تک نہ صرف

اقتصادی سماجی غیر برابری کا شکار ہوتی ہے بلکہ جسے فرقہ وارانہ کشیدگی اور دنگوں کے دوران نفرت اور تشدد کا شکار بھی بننا پڑتا ہے۔
میں یہ سب کچھ کسی اندازے کی بنیاد پر نہیں، حقائق کی بھٹی میں تپ کر کہہ رہا ہوں۔ جن لوگوں کو ان حقائق پر شک گزرے انہیں حال کے فرقہ وارانہ فسادات میں ہلاک ہونے والے لوگوں کی فہرست کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔
مجھے شمالی بہار، وسط بہار اور جھارکھنڈ سنتھال علاقوں میں بسی مومن آبادیوں کے بیچ سماجی غیر برابری کی سطحوں میں صاف صاف فرق دکھائی دیتا ہے۔ میرے لئے جھارکھنڈ سنتھال علاقوں کی مومن آبادی اور آدی باسی قبیلوں کے بیچ فرق کرنا مشکل ہے۔ جن لوگوں نے جھارکھنڈ علاقوں کی اراؤں آبادی اور دوسرے آدی باسی قبیلوں کی زندگی، ان کے رسم و رواج، ان کے عقائد اور ان کی بدحالی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو اس علاقے کی مومن آبادی کے المیے سے واقف ہیں، وہ میرے اس بیان کی سچائی کو زیادہ قریب سے محسوس کریں گے۔
تقریباً ۳۰ سال قبل، ایک سرکاری دستاویز کے لئے مواد کی تلاش میں لگے ایک فرض شناس افسر کو اس وقت حد درجہ استعجاب ہوا تھا جب اسے پلاموں ضلع کے پاٹن اور لسلی گنج علاقے کے گاؤں کے بیشتر مومن گھروں میں پنچ پیر اور شیخ سادھو کے تئیں عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے کوٹھری کے کسی کونے میں مٹی کا ایک چھوٹا ٹیلا دکھائی دیا تھا۔ ایک لمبی مدت تک، اسی ٹیلے کے پاس مومن آبادی نجی اور عوامی سطح پر خراج عقیدت پیش کرتی رہی۔
کہیں نہ کہیں جھارکھنڈ علاقوں کی اس کثیر لیکن ترقی کے مواقع سے محروم آبادی کی ثقافتی جڑیں آدی باسی قبیلہ، خصوصی طور پر اراؤں تہذیب کے

سائے میں پروان چڑھی ہیں۔ وہ چاہیں بھی تو اپنے آپ کو آدی باسی تہذیب کی کچھ اہم اور داخلی خصوصیات سے الگ نہیں کرسکتیں۔

اپنے ضبط وتحمل، غیر مصنوعیت، رہن سہن، بہت حد تک ملبوسات اور پیشہ ورانہ خصوصیات کے سبب جھارکھنڈ کی مومن آبادی آدی باسی برادریوں سے ایک قسم کی نفسیاتی قربت محسوس کرتی ہے۔ انتہائی درجے کے نامساعد حالات کو جھیلنے اور دشوار گزار راہوں پر چلنے کی عادت، دیسی گوروں کی ٹھگی اور ان کے توہمات کا شکار ہونے کے سبب جھارکھنڈ کی مومن آبادی آج انتہائی پسماندہ حالت میں ہے۔

ایک لمبے عرصے تک کانگریس کے سیاسی مفاد سے منسلک رہنے کی وجہ سے مومن آبادی کو پہلے پسماندہ جماعت اور بعد میں انتہائی پسماندہ جماعت کی شکل میں بعض اہم مراعات حاصل ہوئیں۔ لیکن اس آبادی کی آدی باسی جڑوں کو سینچنے اور زمینی سطح پر ان کی ترقی کے لئے کوئی مخصوص اور موثر اقدام نہیں کئے گئے، نہ ہی انہیں سب پلان کے تحت ملنے والی مرکزی مالی امداد سے ہی کوئی فائدہ پہنچایا جا سکا۔

مومن آبادی اور جھارکھنڈ سنتھال علاقوں کی قبیلہ آبادیوں کے بیچ زبان، رسم ورواج، فطرت سے لگاؤ، جسمانی محنت، ایمانداری اور ان کے ساتھ غربت اور استحصال کا آپسی رشتہ آخر کس سماجی سچائی کی جانب اشارہ کرتا ہے؟ کیا اس سچائی کی جانب کہ جھارکھنڈ سنتھال علاقوں میں بسی یہ آبادیاں یکساں طور پر دیسی گوروں درآمد حکمرانوں کے توہین آمیز عادات وخصائل جھیلنے کو مجبور ہیں؟

اگر ایسا ہے تو برسوں قبل ڈیوڈ منجھی نے 'جولہا، کولہا ــــــ بھائی بھائی' کا جو سپنا دیکھا تھا، کیا صوبے کے سیاسی اُفق پر اس سپنے کے سچ ہونے کی علامتیں ظاہر نہیں ہو رہی ہیں؟ اور کیا ایک

دن لکش دیپ کی طرح بہار کے جھارکھنڈ اور سنتھال علاقوں میں بسی پسماندہ مسلم آبادیوں کی یہ لڑائی بھی ایک سماجی حقیقت کی شکل نہیں اختیار کرے گی؟

•

راعین

شہر ہو یا قصبہ، گاؤں ہو یا بستی، شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو، جہاں سڑک کے کنارے یا گلی کے کسی چھور پر، یا پھر گھنی آبادی کے بیچوں بیچ سبزیوں اور پھلوں کی چھوٹی بڑی، دکانیں سجائے کچھ لوگ آپ کو نہ دکھائی دیں۔ ان میں مرد بھی ہیں، عورتیں اور بچے بھی۔ ہر صبح سورج نکلنے کے ساتھ ساتھ مرد عورتوں کا یہ جھنڈ بوریاں، چٹائی یا سینکڑوں پیوند لگے کپڑوں پر ہری سبزیاں اور پھلوں کی ٹوکریاں لئے آبیٹھتا ہے۔ سارا دن سبزیاں تولتے ریزگاری گنتے اور بگڑیل خریداروں کی جھڑکیاں سنتے بیت جاتا ہے۔

ان میں جو عورتیں ہوتی ہیں اور جن کی گود میں بچے ہوتے ہیں۔ انہیں سبزیوں کی بکری کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی کھوج خبر بھی لینی پڑتی ہے۔ انہیں دودھ پلانا ہوتا ہے۔ اور دوسرے ضروری، غیر ضروری کام بھی انجام دینے پڑتے ہیں۔

پیشے کے اعتبار سے انہیں سبزی فروش یا راعین کہا گیا ہے۔ ممکن ہے تاریخ کے کسی عہد میں پیشے کی خصوصیات کے سبب انہیں سبزی فروش کہا گیا ہو۔ لیکن ہندوستانی سماجی نظام کے برے اثرات کی وجہ سے اس آبادی کو ایک منجمد ذات پرست خطاب سے منسوب کر دیا گیا ...... یہی وہ عہد تھا، جب کڑی محنت اور نفع نقصان کے اندیشوں سے ہر لمحہ دوچار ہونے والی یہ آبادی کنجڑا نام سے پکاری جانے لگی ہوگی۔

میں کوئی سماجیاتی تجزیہ کار ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا، نہ ہی ہندوستانی سماجی نظام کی اندرونی تہوں تک پہنچنے کا گمان رکھتا ہوں۔ لیکن سماجی سطح پر پیش آنے والی دل آزاریوں سے متاثر انسانی آبادیوں کا داخلی من سمجھنے کی تھوڑی بہت حسیت ضرور رکھتا ہوں۔ یہی وہ حسیت ہے جو مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ مسلم سماج کے بااثر طبقوں نے جسمانی مشقت اور زمینی پیشے سے جڑی اس بڑی انسانی آبادی کو محض ایک ذات کی شکل دے دی۔

میں سمجھتا ہوں، شاید مسلم سماج کے بااثر طبقات کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا، کیوں کہ ایسا کئے بغیر وہ اس آبادی کو اس پیشے سے جڑے بااثر طبقات کے مسلمانوں سے مختلف نہیں قرار دے سکتے تھے۔

کیا یہ سچ نہیں کہ کلکتہ کا بازار ہو یا رانچی کی پھل منڈی۔ مسلمانوں کا بااثر طبقہ پیشاوری پھل بیچنے والوں اور سبزی فروشوں کے درمیان فرق محسوس کرتا ہے۔

میں بلا جھجک کہنا چاہتا ہوں کہ سماجی تاریخ میں جس موڑ پر کوئی پیشہ یا کاروبار کسی ذات کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اسی لمحے اس آبادی کے اقتصادی سماجی وجود کی بنیاد منتشر ہونے لگتی ہے۔ اس لمحہ اس انسانی آبادی کی ذات ہی اس کے سماجی شناخت بن جاتی ہے اور روایتی طور پر مسلم سماج

کا بااثر طبقہ اسے توہین آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ پیشے اور کاروبار سے جڑی آبادیاں ذات کی پہچان کے خول سے باہر نکل کر پیشے کی لازمیت اور جسمانی مشقت کی اہمیت کو دوبارہ سماجی استحکام عطا کریں؟ ایسا ہونے پر سماج کے دوسرے طبقات کے وہ افراد بھی، جو روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہیں، ان پیشوں سے جڑ سکیں گے۔ اور جو سماجی استحصال آج یا تاریخ کے کسی اور عہد میں، اس آبادی کو جھیلنا پڑا ہے وہ یا تو پوری طرح ختم ہو جائے گا یا پھر ایک عوامی شکل لے کر اپنی خصوصیات کھو دے گا۔

جہاں تک بہار کی راعین آبادی کا سوال ہے، اسے سماجی، تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے انتہائی پسماندہ برادریوں کے مساوی حقوق دلانے کی سمت ابتدائی قدم بڑھائے جا چکے ہیں۔ ستمبر ۱۹۹۱ء میں ریاستی حکومت کی ہدایت پر انوگرہ نرائن سنہا انسٹی ٹیوٹ نے اس آبادی کی، سماجی، تعلیمی اور اقتصادی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ایک ابتدائی رپورٹ تیار کی تھی۔ اس رپورٹ میں صوبے کے چار اہم ضلعوں ــــ نوادہ، مدھوبنی، سہرسہ اور بھوجپور کے 350 خاندانوں کے سروے کی بنیاد پر اس آبادی کو انتہائی پسماندہ برادری کی فہرست میں شامل کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔

حالانکہ اس سفارش کی روشنی میں ریاستی حکومت کا قطعی فیصلہ ہونا باقی ہے، اور اس درمیان پسماندہ اور انتہائی پسماندہ برادریوں کی پہچان کے لئے الگ سے ایک کمیشن کی تشکیل ہو چکی ہے، پھر بھی سفارش کے نتائج اور حقائق سے متعارف ہونا سودمند ثابت ہوگا۔

مطالعے کے دوران راعین آبادی کے جن 350 خاندانوں کو سروے میں شامل کیا گیا، ان کا 96.29 فیصد حصہ یہ ماننے کو لاچار ہے کہ مسلم

سماج کی با اثر برادریاں انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ شادیات کے رشتوں کو مناسب نہیں سمجھتیں۔ اپنے تئیں توہین آمیز اور پر حقارت رویہ جھیلتے رہنے کے سبب اس آبادی کے بیچ تھوڑے تھوڑے وقفے پر سماج کی دوسری استحصال زدہ برادریوں کی طرح خود ارتکازی احساس تشنگی جنم لیتا رہا ہے۔

اس آبادی کے درمیان یہ حس بھی کام کرتی رہی ہے کہ موجودہ مسلم سماجی نظام میں اپنی جسمانی مشقت اور اپنے پیشے کی وجہ سے ہی انہیں مسلسل ناسازگار حالات جھیلنے پڑتے ہیں۔ اس آبادی کے من میں جسمانی مشقتوں سے دور بھاگنے اور دوسرے طبقوں کی طرح جسمانی مشقتوں سے مختلف کاروبار کھڑا کرنے کی خواہش بھی پیدا ہوتی رہی ہے۔ ہم اس رجحان کے مثبت پہلوؤں کے تئیں بے توجہی نہیں برت سکتے، حالاں کہ اس رجحان نے اس آبادی کے غریب اور بدحال طبقوں کو بڑے شہروں، خصوصی طور پر مہانگروں کی جانب مراجعت پر مجبور کر دیا ہے۔ بڑے شہروں کا ماحول انہیں ایک طرح سے اچھا لگنے لگا ہے، کیونکہ وہاں کوئی ان کی کوکھ سے جڑی برادریوں کا نام نہیں پوچھتا ہے۔

ایک تحقیقی مطالعے کے مطابق دیہی علاقوں سے مراجعت کے باوجود تقریباً ۹۱ فیصد لوگ آج بھی سبزی اور پھل بیچنے کے کاروبار میں لگے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے پاس نہ تو اپنی زمین ہے اور نہ سرمایہ، یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس انسانی آبادی میں تقریباً 96 فیصد خاندانوں میں خواتین بھی اپنے کاروبار میں مردوں کے ہاتھ بٹاتی ہیں۔

مطالعے کا وہ حصہ سچ مچ آنکھیں کھولنے والا ہے، جس میں اس آبادی کی تعلیم اور حرف آشنائی کا بیورا پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ 350 خاندانوں میں سے 213 خاندان ایسے ہیں، جن میں ایک بھی فرد حرف آشنا نہیں

ہے۔ ان کی تعداد 61 فیصد ہے۔ اس سلسلے میں مطالعے کے دوران پایا گیا کہ آٹھ خاندانوں کے نو افراد مکمل طور پر حرف نا آشنا ہیں۔ چار خاندانوں کے آٹھ افراد اور چار دیگر خاندانوں کے سات افراد بھی مکمل طور پر علم حروف سے نا آشنا ہیں۔ اس طرح یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ تقریباً پوری راعین آبادی تعلیم کے معاملے میں انتہائی طور پر پسماندہ ہے۔

جن 350 خاندانوں کو مطالعے کے لیے منتخب کیا گیا تھا، ان میں 281 خاندانوں کی روزانہ آمدنی 20 روپے یا اس سے کم ہے۔ ظاہر ہے یہ آمدنی ایک علامت کی شکل میں اس آبادی کی اقتصادی پسماندگی کا ثبوت ہے۔

1978ء میں ریزرویشن قوانین کو نافذ کرتے وقت راعین آبادی کو پسماندہ برادریوں کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ تب سے انہیں پسماندہ برادریوں کے مساوی ریزرویشن کی سہولیات ملتی رہی ہیں۔

تقریباً ۱۲ برسوں کے بعد انسٹی ٹیوٹ کی مطالعاتی رپورٹ میں اس آبادی کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ ۱۲ برسوں کی ریزرویشن سہولیات کے باوجود اس آبادی کی زندگی کی سطحوں میں کوئی قابل ذکر اور اطمینان بخش تبدیلی نہیں آئی۔ کیا اس کا یہ مطلب نکالا جائے کہ اس طویل مدت میں ریزرویشن قوانین کی سہولیات کے **باوجود** اسکے فوائد کہیں اور مخصوص پسماندہ آبادیوں کے بیچ سمٹ کر رہ گئے؟

آج راعین آبادی انتہائی پسماندہ برادری کی شکل میں منظوری کے لئے جد وجہد کر رہی ہے۔ عنقریب ان کی یہ مانگ پایہ تکمیل تک پہنچنے والی ہے۔ لیکن کیا یہ ضروری نہیں کہ ان غیبی وجوہات کی شناخت کی جائے جو اب تک اس آبادی کو ترقی کے مواقع سے محروم رکھتی آئی ہیں؟ استحصال

اور عدم مساوات کے موجودہ سماجی پس منظر میں اگر اس بڑی انسانی
آبادی کے درمیان کچھ صاحب فہم و ادراک افراد اپنی تگ و دو، جد وجہد
اور غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے سبب آگے بڑھ سکے ہیں، تو اسے موجودہ
مسلم سماجی نظام کے تحت ایک معجزہ سمجھنا چاہیے۔ دراصل ہم ان افراد کو
اس برادری کے ساگر میں کچھ ٹاپوؤں کا نام دے سکتے ہیں۔

●

گدّی

نیچر اپنے آپ میں ایک چونکانے والا نظام وجود ہے۔ اس نے انسان کو کئی سطحوں پر متحرک و منظم کیا ہے۔ انسانی تاریخ کو نیچر سے حاصل ہونے والے بیش بہا اثاثے کا گہرائی میں جاکر مطالعہ کرنا اپنے آپ میں روحانی تسکین کا وسیلہ ہے۔

نیچر کے اسی نظام وجود کا ایک انسانی پہلو ہے سماج، جسے ہم اپنی چالاکی اور عیاری سے کبھی کبھی ایکتا کے دھاگے میں باندھتے ہیں اور کبھی اسے انتشار پذیر بھی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ہم اس کے توانا شانوں پر سوار ہو کر مذہب کی بالاترین منزل پر پہنچ جاتے ہیں، اور کبھی کلچر کی اعلیٰ ترین چوٹی پر، کبھی ہم اس کا سہارا لے کر اقتدار و قوت اور کبھی اس کی پرچھائی بن جاتے ہیں۔

ہم مذہب کی بالاترین منزل پر ہوں یا کلچر کی اعلیٰ چوٹی پر، ہم اقتدار و قوت ہوں یا اس کی پرچھائی، ہم نے سماج کی گنوار، اجڈ اور بنجر نظر آنے والی طاقتوں

کے تئیں انصاف برتنے کا فن نہیں سیکھا۔ ہم در اصل انہیں انسانی جماعتوں کے تئیں انصاف برتنے کے قائل ہیں، جو ہمیں کسی اعتبار سے قوی ہیکل نظر آتی ہیں۔ یعنی اگر ہم میں دولت و امارت کا، جسمانی طاقت کا، تشدد کا یا عیاری کا ہنر نہیں ہو تو نیچر کے بدل نظام وجود میں بھی سماج ہمارے تئیں انصاف نہیں برتے گا۔ یہی وہ پہلو ہے، جو بعض اوقات تاریخ کی بنیادوں کو عام لوگوں کی نظر میں کھوکھلا بنا دیتا ہے۔

آپ نے اپنے شہر یا گاؤں میں نچروں پر یا اپنی پشت پر اپنا گھونسلہ اُٹھائے بنجارہ عورتوں کو ضرور دیکھا ہوگا۔ اکثر یہ بنجارہ عورتیں اپنی مسافت یا پڑاؤ کے دوران تماش بینوں کو سنیمائی مناظر کی یاد دلاتی ہیں۔ ان کی شکل و صورت، ان کی عادتیں، ان کے ملبوسات، سب کچھ میں ایک طلسم چھپا ہوتا ہے۔

بنجارہ عورتیں کسی شہر، کسی گاؤں کی سرکاری، غیر سرکاری، عوامی یا نجی زمین کے خطے پر اپنے ہاتھوں سے تنبو گاڑتی ہیں۔ تنبو گاڑتے وقت بنجارہ عورتیں یہ نہیں دیکھتیں کہ انہوں نے اپنے قیام کے لئے جس جگہ کا انتخاب کیا ہے وہاں انہیں زندگی کی عام سہولتیں ملیں گی یا نہیں۔ تنبو لگاتے وقت وہ یہ بھی نہیں سوچتیں کہ وہاں انہیں خاطر خواہ محافظت مل سکے گی یا نہیں۔

بنجارہ عورتیں کیمور کی پہاڑیوں کی طرح کسی بھی شہر یا گاؤں کی پرتی زمین پر راتوں رات آکر پسر جاتی ہیں۔ اور تھوڑے وقفے کے لئے علاقے بھر میں رومان پرور جادو اپنے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔

ایسے ہی بنجارہ کلچر میں پلی ہوں گی وہ عورتیں، جو گائے اور بھینس کے جھنڈ لے کر تقریباً ایک سو سال قبل اتر پردیش اور ہماچل پردیش سے چل کر بہار کے کئی حصوں میں بس گئیں۔ انہیں یا تو چمپارن کے گھنے جنگل پسند آئے یا پھر بہار کے بھُکاری علاقے۔

یہی بنجارا آبادی مسلم گوالا یا گدی آبادی کہلائی۔ ان کا پیشہ گائے بھینس چرانا

دودھ دوہنا اور بیچنا ہے، یہ آبادی مسلمان ہوتے ہوئے عام مسلمانوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ کچھ لوگ مزاحاً انہیں انسان، لیکن انسان سے مختلف آبادی کہہ کر پکارتے ہیں۔

مسلم سماج میں گدیوں کی طرح نیچر کی گود میں کلکاریاں بھرتی، دکھ درد اور توہین وتضحیک برداشت کرتی، خون کے گھونٹ پیتی کوئی دوسری آبادی شاید مشکل سے دیکھنے کو ملے۔

شاید یہ مسلم سماج کی تنہا آبادی ہے، جس کے نظام وجود میں انسانی رشتوں کی پیچیدہ گرہیں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملیں گی۔ یہ آبادی گائے کے تھنوں سے بہنے والے سفید دودھ کی طرح صاف وشفاف اور پاک ہے۔

شاید مشکل ہو، گدی آبادی کے ہجوم میں کسی ایسے آدمی کو ڈھونڈنا جو عام بول چال کی زبان میں سیدھی سپاٹ گالیوں کا استعمال نہ کرتا ہو، شور شرابہ نہ کرتا ہو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہنگامے نہ کرتا ہو، یہ سب جیسے اس آبادی کی خصوصیات رہی ہیں۔ لیکن ان سے الگ اس آبادی کی کچھ اور خصوصیات ہیں۔ ان میں جوکھم اٹھانے کی عادت اور حوصلہ ہے۔ وہ شہر کے چالاک عیار اثر دار مسلمانوں کی طرح کسی کو نیچا دکھانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور نہیں لگاتے، وہ دوستی کرنا اور اسے نبھانا جانتے ہیں۔

مگر وہ بعض اوقات بپڑی سے اتر جانے پر دشمنی بھی کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں دوستی کرنا تو آتی ہے، لیکن دشمنی کرتے وقت اکثر وبیشتر وہ خود اپنے آپ کو دشمنی کی آگ میں جھلس ڈالتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے گدی آبادی کو شہری اثر دار مسلمانوں سے دشمنی نبھانے اور بغض وحسد کے تیروں سے دوسروں کو لہو لہان کرنے کا فن سیکھ لینا چاہئے۔

جو لوگ اپنی حساس طبعیت کے سبب دشمنی اور کینہ پروری کے ترازو پر اپنے رشتوں کو نہیں تول پاتے وہ سماجی انسانی رشتوں کا درد جھیلنے کو مجبور

ہو جاتے ہیں ۔

ایسے ہی لوگوں میں ایک ہیں غیاث احمد گدی، جنہوں نے اپنی جدوجہد، اپنی شکست خوردگی اور اپنے المیے کو اپنی متعدد کہانیوں کا داخلی موضوع بنایا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں ہیں، صدیق مجیبی، جنہوں نے اپنی غزلوں میں زندگی کی تلخیوں سے پیدا ہونے والے اعلیٰ اقدار کو جگہ دی ہے۔ یہ دونوں فنکار اور ان کے ساتھ الیاس احمد گدی مجھے اکثر امریکہ کے نگرو شاعروں یا پھر جنوبی افریقہ کی آزادی کے لئے ادبی ثقافتی سطح پر نامساعد حالات جھیلنے والے ادیبوں کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کا ادب محض پروپیگنڈہ نہیں، یہ ان کی اپنی زندگی سے پیدا ہونے والی کسک کا آئینہ ہے ۔

غیاث احمد گدی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ نہ تو ان کی کہانیاں ان کی شخصیت سے الگ ہیں، اور نہ ان کی شخصیت ان کی کہانیوں سے، دونوں ایک تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ایک ہی زندگی کے دو پہلو ہیں ۔

بہار میں لکھے گئے یا لکھے جا رہے ادب میں کسی ایک انسانی آبادی کی جدوجہد، کشیدگی اور المیے سے متعلق حقائق کی روشنی میں لکھی گئی تحریریں بہت زیادہ مقدار میں نہیں ملتیں۔ پھر بھی جو لوگ مسلم سماج کے درمیان استحصال زدہ آبادیوں کی جڑیں تلاش کرنا چاہتے ہیں، انہیں غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی کی کہانیوں اور صدیق مجیبی کی شاعری کا سنجیدہ مطالعہ کرنا چاہئے۔

بہار میں گدی آبادی کو ہم بھلے ہی ان کی پیشہ ورانہ شناخت کے سبب کسی قبیلے کا نام نہ دے سکے ہوں، لیکن یہ آبادی سماج کے قبیلہ نظام کی تمام شرطیں پوری کرتی ہے ۔

گدی سماج میں مذہب یا قانون کو وہ روایتی حیثیت حاصل نہیں ہے، جو کسی دوسری مسلم یا ہندو آبادی کو حاصل ہے۔ ان کا قانون اور ان کا مذہب ان کی پنچایتوں میں جنم لیتا ہے۔ ان کے رسم و رواج، اخلاقیات کی کسوٹی پر پورے

نہیں اترتے ۔ بعض اوقات گدی آبادی کے درمیان رواسم ورواج روایتی مسلم مزاج کو نازیبا بھی محسوس ہوتے رہے ہیں ۔

ایک لمبی مدت تک بہار کی گدی آبادی کو تعلیم سے بیر رہا ہے ۔ دراصل گدی آبادی کے بیچ یہ نظریہ کام کرتا رہا ہے کہ بچے بچیوں کو اسکول کالج بھیجنا تضیع اوقات ہے ۔ یہی سبب ہے کہ گدی آبادی کا ایک بڑا حصہ ناخواندگی کی تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے ۔

آج بھی گدی آبادی اپنی بنیادی کلچرل جڑوں کو ہی اپنا ورثہ سمجھتی ہے ۔ ان کا کلچر ہی ان کا مذہب اور ان کی روحانیت ہے ۔

گدی آبادی اردو زبان کو اپنی مادری زبان مانتی ہے ، لیکن وہ زبان ، جسے وہ اپنے سماج کے اندر دوران گفتگو استعمال کرتی ہے ، عام اردو زبان سے حد درجہ مختلف ہے ۔ بول چال کی یہ زبان صرف گدی ہی استعمال کر سکتے ہیں ، حالانکہ اسے سمجھنا غیر گدیوں کے لئے بھی آسان ہے ۔

ہماچل پردیش اور اتر پردیش کے ٹھنڈے علاقوں میں گدی آبادی کا روایتی حسن دیکھتے بنتا ہے ۔ یہ حسن کڑی محنت اور نیچر کے امتزاج سے بنا ہے ۔

ممکن ہے ، وقت نے گدی مردوں سے ان کا سیلانی پن اور گدی عورتوں سے ان کا بنجارہ پن چھین لیا ہو ۔ لیکن نیچر کی گود سے ان کا اٹوٹ رشتہ جوں کا توں قائم ہے ۔ ان کی رگوں میں باثر مسلم سماج کا خون نہیں دوڑتا ۔ ان کی رگوں میں نیچر خود لہو کی دھار بن کر رواں دواں ہے ۔

گدی آبادی خستہ حال مسلم سماج کا ایک دردناک المیہ ہے ۔ اس آبادی کو اپنی ثقافتی نجات کے لئے ایک سدھارتھ چاہئے ۔ کون ہے وہ سدھارتھ ؟

●

منصُوری

شیت کا موسم نہ آئے، اور شیت لہری نہ چلے تو، ممکن ہے ہمیں ان کی یاد نہ آئے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ شیت کا موسم نہ آئے اور شیت لہری نہ چلے؟

شیت کا موسم آنے سے پہلے ہی 'تانی' سنبھالے بدحال لوگوں کی ٹولیاں گلی کوچوں کا چکر لگانے لگتی ہیں۔ ان کے کاندھوں پر 'تانی' کے علاوہ لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے، پوٹلی یا تھیلے میں دھاگے اور الگ الگ سائز کی سُوئیاں ہوتی ہیں۔ اس ٹولی میں مرد ہوتے ہیں اور بچے، عورتیں اس ٹولی کا حصّہ نہیں ہوتیں۔

عام طور پر لوگ انھیں روئی دُھننے والا، دُھنیا کہتے ہیں۔ مگر ان کے لیے دو نام اور استعمال ہوتے ہیں، ایک منصوری، دوسرا انداف۔

حالانکہ پیشہ ور آبادی کی شکل میں گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں ان کی آبادی کا صحیح صحیح پتہ لگانے کی کوئی سنجیدہ کاوش نہیں کی گئی، پھر بھی، ایک

عام قیاس کے مطابق بہار میں اس پیشہ ور آبادی کی تعداد ۳۵ لاکھ کے آس پاس ہے۔ یہ آبادی خاص طور سے گنگا اُس پار مدھوبنی، مظفر پور، چمپارن، سیتا مڑھی، سمستی پور، مدھیپورہ، سہرسہ اور کٹیہار ضلعوں اور گنگا اِس پار گیا، پلاموں، بھوجپور، روہتاس، رانچی، صاحب گنج اور پٹنہ ضلعوں میں آباد ہے۔ ایک قیاس ہے کہ اکیلے مدھوبنی، سہرسا اور چمپارن ضلعوں میں اس آبادی کا تقریباً ۶۰ فیصد حصّہ آباد ہے۔

پیشے کے لحاظ سے یہ آبادی خاص طور سے روئی دُھننے، لحاف، توشک تیار کرنے اور گدّ ا بنانے کا کام کرتی ہے۔ مگر یہ کام پورے سال کے لیے ان کی گزر اوقات کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے سال کا تین چوتھائی حصّہ انھیں دوسرے روزگار کی تلاش میں گزارنا پڑتا ہے۔

دھیرے دھیرے اس پیشہ ور آبادی نے اپنے لیے کچھ دوسرے روزگار ڈھونڈ بھی لیے ہیں، جیسے سمستی پور، مظفر پور اور سیتا مڑھی علاقوں میں یہ آبادی گوشت یا سبزیاں بیچنے کا کام بھی کرنے لگی ہے۔ کہیں کہیں یہ آبادی ٹولیوں میں بٹ کر خردہ بسکٹ یا چاکلیٹ وغیرہ بیچنے کا کام بھی کرتی ہے۔

سچ پوچھا جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اس آبادی کا تقریباً اٹھانوے [۹۸] فی صد حصّہ بے زمین ہے۔ اس آبادی کے نیم انسانی وجود سے متاثر ہو کر ہی مونگیری لال آیوگ نے اسے انتہائی پسماندہ طبقوں کی فہرست میں شامل کیا تھا۔

نہایت پس ماندہ طبقے میں شامل رہنے کی وجہ سے تعلیم کے معاملے میں اس آبادی کو کچھ سہولیات ضرور حاصل رہی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں داخلہ اور فیس وغیرہ معاملے میں بھی انھیں کچھ رعایتیں ملتی رہی ہیں۔ لیکن یہ رعایتیں اس جماعت کی تعلیمی سطح میں کوئی قابل ذکر فرق پیدا نہیں کر سکی ہیں۔ آج بھی اس جماعت کی عام علمیت اور تعلیمی سطح حد درجہ مایوس کُن ہے۔

اس جماعت کے درمیان گزشتہ کئی دہائیوں سے لگاتار کام کرنے والا ادارہ

"جمعیت المنصور" دعویٰ کرتا ہے کہ منصوری آبادی کا پانچ فی صد حصہ تعلیم یافتہ ہے ۔ لیکن زمینی سطح پر راقم الحروف کے ذریعہ کرائے گئے سروے سے اس دعوے کی صداقت پر حرف آتا ہے ۔

سرکاری نوکریوں میں بھی ذکر بالا ادارے نے نصف فی صد حصہ داری کا دعویٰ کیا ہے لیکن یہ دعویٰ بھی آسانی کے ساتھ منظور نہیں کیا جا سکتا ۔ اس آبادی کے جو افراد سرکاری نوکریوں میں ہیں، وہ تیسرے اور چوتھے درجے سے آگے نہیں بڑھ پائے ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہی سبب ہو، جب گزشتہ دنوں محکمہ راج بھاشا میں اردو ٹائپسٹوں کی تقرری میں اس برادری کے توقع سے زیادہ نوجوانوں کی تقرری ہوئی تو اسے ایک بڑی حصولیابی کی شکل میں منظور کیا گیا ۔ حال کے چند برسوں میں صوبے کی کچھ گزیٹیڈ ملازمتوں میں بھی اس جماعت کے افراد کو نمائندگی ملی ہے ۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ تکنیکی اداروں میں، خاص طور سے میڈیکل اور انجینیرنگ کالجوں میں انکی نمائندگی عام طور سے نہیں کے برابر ہے ۔

سیاسی سطح پر یہ آبادی، آزادی کے بعد ایک لمبے عرصے تک کانگریس کی جھولی میں رہی ہے ۔ کانگریس کے کئی نامور رہنماؤں نے وقتاً فوقتاً اس آبادی کے مسائل کے تئیں ہمدردی کا اظہار کیا ہے ۔ لیکن ان کے چہار طرفہ ارتقا کے لیے کبھی کوئی منصوبے تیار نہیں کیے گئے ۔ اقتدار کی مختلف اکائیوں میں انھیں باعزت حصہ داری دینے کی بات تو دور رہی، ان کے ارتقاء کے لیے ایسی صنعتی اور امدادی اکائیاں بھی قائم نہیں کی جا سکیں، جو ان کی عام بود و باش کا ذریعہ بن سکتی تھیں ۔ ان کے تئیں نابرابری کا احساس اب بھی برقرار ہے ۔

منصوری آبادی مسلم اقلیت سماج کا ایک محنت کش طبقہ ہے ۔ اس آبادی کا ایک بڑا حصہ دلی، پنجاب اور بنگال کے شہروں میں مزدوری یا پھر کپڑا ملوں میں کام کرتا ملے گا ۔ اکیلے کلکتہ میں کچھ سال قبل تک ہاتھ رکشہ چلانے والوں کا ایک اچھا خاصہ طبقہ شمالی بہار کی منصوری آبادی سے آتا تھا ۔

منصوری آبادی کڑی محنت اور ایماندارانہ زندگی گزارنے کے لیے جانی جاتی ہے۔ اس آبادی نے کئی دوسری مفلوک الحال مسلم اقلیت آبادیوں کی طرح مشینی عہد کی ریاکاریوں کے سبق نہیں پڑھے ہیں۔ یہ آبادی معصومانہ ڈھنگ سے کسی کی حمایت یا مخالفت کرتی ہے۔ اس آبادی نے پیٹھ پیچھے حملہ کرنے کا ہنر نہیں سیکھا ہے۔ اس کام کے لیے اس آبادی کے پاس وقت کی کمی ہے۔ اسی لیے اب تک یہ آبادی کسی سیاسی جماعت کی ووٹ کی پونجی نہیں بن پائی ہے۔ اس لحاظ سے اس آبادی کے پاس سیاسی بلیک میل کی دبنگیت بھی نہیں ہے۔

منصوری آبادی کے افراد کے اداس من کو ٹٹولنے پر کئی دل چسپ حقائق روشنی میں آتے ہیں۔ ایک اوسط، وفادار اور اپنے حقوق کے تئیں پوری طرح ذمہ دار شہری کی شکل میں ہم سنہولا کے ۸۰ سالہ محمد عبدالرّؤف منصوری کا نام لے سکتے ہیں۔ تقریباً آنسوؤں کی جھڑی کے درمیان انھوں نے ایک دن مجھ سے اپنے والد ڈومن دُھنیا کا ذکر کیا تھا، جو انھیں آٹھ دس برس کی عمر میں اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ محمد عبدالرؤف کی ماں سیتو خاتون نے ہی انھیں محنت مزدوری کرکے گاؤں کے مدرسہ میں تعلیم دلوائی تھی، اور اس لائق بنایا تھا کہ وہ آگے اپنے بچوں کو بھی تعلیم دلا سکیں۔

عبدالرؤف کو اچھی طرح یاد ہے کہ ان کا بھائی بدّرو پانچ روپیے ماہانہ پر کسی کاشت کار کے گھر بیگاری کرتا تھا۔ اس بیگاری نے ہی ایک دن اس کی جان لے لی تھی۔

خود، عبدالرؤف نے ۳۰ روپیے ماہانہ پر ۱۹ برسوں تک گاؤں کے بچّوں کو ابتدائی تعلیم دی۔ عبدالروف نے ۲۰ روپیے ماہانہ پر کہل گاؤں کے نزدیک بٹیشور استھان پر امین کا کام کیا تھا۔ مہنگاواں کے گھٹّی گاؤں میں ۶ برسوں تک بچوں کو پڑھایا۔ اس درمیان انھوں نے ۶ برسوں تک گاؤں میں کولھو پیڑنے کا کام بھی کیا۔ پھر ۶۰ روپیے ماہانہ پر رانچی کے نزدیک اٹکی میں انھوں نے تقریباً

بارہ برسوں تک بچوں کو بنیادی تعلیم دینے کا کام کیا۔

عبدالرؤف کی عمر اس وقت ۸۰ برس سے اوپر ہو چکی ہے۔ ان کی زندگی خدائی خدمت کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ ان کی ماں نے دوسروں کے گھروں میں برتن مانجھ کر اپنے یتیم بیٹے کو تعلیم دلوائی تھی۔ خود انھوں نے کاشتکاروں کی زمین جوت کر اور مٹی کاٹ کر، اپنے ہاتھوں بوجھ اٹھا کر اپنے بیٹے کو مدرسہ اور کالج کی تعلیم دلوائی اور اسے ایمان اور عزت کے راستے پر چلنے کا طریقہ سکھلایا۔

عبدالرؤف جب میرے سامنے اپنی ماں کا ذکر کر رہے تھے، ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی تھیں، اور ان کی آواز میں لرزش تھی۔

میں نے صرف ایک علامت کے بطور منصوری آبادی کے اس آہنی پیکر کا ذکر کیا ہے۔ یہی آہنی پیکر دراصل ادا اس مسلم اقلیت آبادیوں کی آئندہ جدوجہد کا رہبر کہلائے گا۔

●

میں بہار کی مسلم پسماندہ آبادیوں کے نام پر کام کرنے والی تنظیموں کے طرزِ عمل اور طرزِ فکر سے مطمئن نہیں ہوں۔ اخباروں میں وقتاً فوقتاً ان تنظیموں کے سربراہوں کے بیانات ضرور پڑھتا رہتا ہوں۔ لیکن ان بیانات سے ان تنظیموں کے خلوص اور نیک نیتی کی بجائے مصلحت پسندی اور سودے بازی کی بُو آتی ہے۔ بیشتر معاملات میں ان تنظیموں کے سربراہوں نے اپنے سیاسی، سماجی وجود کو قائم رکھنے کے لیے متعلقہ پسماندہ آبادیوں کے اعداد و شمار کا استحصال کرنے کی کوشش کی ہے۔

خصوصی طور پر صوبے کی بُنکر تنظیموں کو لے کر میرے دل و دماغ میں کئی مثبت اور منفی سوالات گونجتے رہے ہیں۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے مالی تعاون سے بہار کے بنکروں کی فلاح سے متعلق متعدد اسکیمیں چلائی گئیں۔ ظاہر ہے کہ ان اسکیموں کا ایک اہم مقصد عام بُنکروں کو خطِ غربت سے اوپر اٹھانا تھا۔ لیکن کیا تجربات یہ نہیں بتاتے کہ بیشتر تنظیمیں اپنے اس مقصد کے حصول میں ناکام رہی ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ بنکروں کی تنظیموں کے نام پر بیشتر رہ نماؤں نے اپنی نجی جائداد اور ملکیت میں ناقابل بیان اضافہ کر لیا، اور عام بنکر سماج حسب روایت مالی مشکلات اور افلاس کے شکنجوں میں گرفتار رہا۔

میں نے بہار کی پسماندہ مسلم آبادیوں کے حالات کا گہرائی سے مطالعہ کرتے وقت شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ الگ الگ پسماندہ آبادیوں کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی صورتِ حال سے متعلق حقائق اب تک منظر عام پر نہیں لائے جا سکے ہیں۔ منڈل کمیشن کی سفارشات لاگو ہونے کے بعد بھی اکثریتی فرقوں کے درمیان پسماندہ برادریوں کے دل و دماغ میں یہ بے جا تاثر کام کرتا رہا کہ منڈل کمیشن کے زمرے میں محض اکثریتی متوسط پسماندہ طبقے ہی آ سکتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بہار میں نافذ ریزرویشن قوانین اور منڈل کمیشن کی سفارشات میں صوبے اور ملک کی بیشتر مسلم پسماندہ آبادیاں برابر کی حصہ دار ہیں۔

میں نے یہ ضروری سمجھا کہ بہار کی پسماندہ مسلم آبادیوں سے متعلق کچھ تاثراتی مضامین لکھے جائیں، تاکہ نہ صرف مسلم سماج، بلکہ ہندو سماج، خصوصی طور پر پسماندہ ہندو سماج اس صوبے کی بیشتر افلاس زدہ اور مفلوک الحال مسلم پسماندہ آبادیوں کے سیاسی، سماجی مقدر سے روشناس ہو سکے۔

ان مضامین کو لکھتے وقت میں نے شدت کے ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ بہار کے بیشتر دیہی علاقوں میں مدرسوں اور مکتبوں کے لامتناہی جال کے باوجود پسماندہ مسلم آبادیوں کے درمیان تعلیم اور خواندگی کا تناسب حد درجہ پست اور مایوس کن ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے درمیان مذہبی، سماجی اور ثقافتی سطحوں پر فعالیت کا دعویٰ کرنے والی بیشتر مسلم تنظیموں نے یا تو خواندگی اور تعلیم کی طرف توجہ ہی نہیں دی، یا پھر اپنے محرکات کا دائرہ شہروں تک محدود رکھا۔ بعض تنظیموں نے تکنیکی تعلیم اور اسکول، کالج کی تعلیم کو بھی حصولِ زر کا ذریعہ سمجھ کر اس میں کسی حد تک دل چسپی لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان ضلعوں میں بھی جہاں پسماندہ مسلم آبادیوں